ماہنامہ

مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

"آج پھر مجھے جامعۃ الفلاح میں حاضری کی سعادت میسّر آئی۔

میں اس ادارہ کا عقیدت مند ہوں یہاں آکر ہمیشہ یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اس کے عزائم بلند ہیں مجھے امید ہے کہ ان عزائم کو اللہ تعالیٰ عملی تعبیر سے نوازے گا"

سید حامد
سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۹ اکتوبر ۱۹۹۳ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیات نو

بلریاگنج

جلد: ۸ رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ مارچ ۱۹۹۳ء شمارہ: ۳

بدل اشتراک

سالانہ زر تعاون:	۵۰ روپے
طلبہ کیلئے:	۴۰ روپے
خصوصی زر تعاون:	۱۰۰ روپے
اعزازی زر تعاون:	۱۰۰۰ روپے
غیر ممالک سے زر تعاون:	۲۵ امریکی ڈالر
قیمت فی شمارہ:	۵ روپے

اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپکی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ لہٰذا چندہ جلد روانہ فرمائیں۔

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

مدیر

محمد اسمٰعیل فلاحی

معاون مدیر

عبد البر اثری فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ مجلہ "حیات نو" جامعۃ الفلاح بلریاگنج اعظم گڑھ یوپی ۲۷۶۱۲۳

نشاط آفسیٹ پریس ٹانڈہ

کتب خانہ محمد اشفاق عالم فلاحی جامعۃ الفلاح

غزل

شفیع اللہ خاں راز امباڑوی
لکچرار شعبۂ تاریخ

آدمی مایوس ہونا چھوڑ دے
جسم پر کانٹے نظر آنے لگے
زندگی تدبیر کی مٹھی میں ہے
غیر ممکن ہے کوئی جنگ حیات
ڈوبنے والوں پہ اب تو رحم کر
زندگی کو چاہئے روشن چراغ
سامنا کر مشکلات زیست کا
ایک دن طوفاں بہا لے جائے گا

اپنی مجبوری کا رونا چھوڑ دے
اب تو پھولوں کا بچھونا چھوڑ دے
کم سے کم قسمت کا رونا چھوڑ دے
طنز کے نشتر چبھونا چھوڑ دے
ناخدا کشتی ڈبونا چھوڑ دے
آدمی تاریک کرنا چھوڑ دے
چھپ کے تنہائی میں رونا چھوڑ دے
راز تو ساحل پہ سونا چھوڑ دے

غزل

عزیز بگھروی

صلح جو ہے تو کوئی جنگ نواز
ہم نے کر کے اسے نظر انداز
زندگی سے نہیں ہے ہم آہنگ
منتشر امن کے پیغمبر سب
کر دیا مجھ کو بے خبر مجھ سے
لاکھ موسم ہو ساز گار مگر
کامرانی کے بعد بھی تو بہ
زندگی کیا ہے پوچھئے ہم سے
کس سے کہئے عزیز دل کی بات

اپنے اپنے ضمیر کی پرواز
توڑ ڈالا غرور فتنہ ساز
ایک بھی لہجہ ایک سی آواز
ایک ہی سا رہے تفرقہ پرداز
اے شب ہجر تیری عمر دراز
منحصر بازؤں پہ ہے پرواز
چہرہ چہرہ شکست کا غماز
ہم نے دیکھے ہیں اب نشیب و فراز
آدمی آدمی زمانہ ساز

نقوش حیات نو

صفحہ

اداریہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن...... — محمد اسماعیل فلاحی — ۲

بحث و نظر

مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کے مسائل اور انکا حل — مولانا صدرالدین اصلاحی — ۱۱

قوم عاد کے آثار دریافت کر لئے گئے — ثروت جمال اصمعی — ۲۲

جواں ہوں اگر میری قوم کے جسور و غیور — خالدہ تسنیم فلاحی — ۲۸

اخبار علمیہ

ابن العلم فلاحی — ۳۸

اقتصادیات پر قرآنی موسوعہ۔ عربی تعلیم بذریعہ ٹیلی ویژن

شاہ سعود یونیورسٹی میں اردو درس شروع ہوگا۔

یونیورسٹیوں میں طلبہ کو یہودی سازشوں سے باخبر رکھنے کی تجویز

لکھ رہا ہوں جنوں میں

لکھے کو کون ٹال سکے ہے کبھی میاں — ابواللسان نقوی — ۴۳

شعر و نغمہ

غزلیں — شفیع اللہ راز، عزیز بگھروی — ٹائٹل

نشریات جامعہ

بہی خواہان جامعہ کی خدمت میں — حاجی عبدالمتین — ۴۷

جامعہ کے لیل و نہار

۴۹

نظامت میں تبدیلی، الوداعی نشست — محمد اسماعیل فلاحی

جمعیت کے سالانہ انعامی مقابلے۔ — ابوصالح اعظمی

محمد اسمٰعیل فلاحی

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن...

کسی ملت کا مستقبل اور اس کا سب سے قیمتی سرمایہ اس کی نوجوان نسل ہوا کرتی ہے۔ دنیا کی ہر قوم فطری طور پر اپنے بچوں پر سب سے زیادہ توجہ دیتی ہے۔ کسی سے اس کا مال و منال چھین لیا جائے، وہ برداشت کرے گا لیکن اپنی اولاد سے دست بردار ہونا اسے کبھی گوارا نہیں ہوگا، لوگ اپنی اولاد کا دنیوی مستقبل بنانے کی بڑی فکر کرتے ہیں لیکن ایک مومن کی نگاہ دوررس دنیا سے آگے بڑھ کر موت کے اس پار تک جا پہنچتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے بچہ کا یہ حقیقی مستقبل ــ موت کے بعد کا مستقبل ــ دھندلا اور تاریک نہ رہے۔ وہ راتوں کو اٹھ کر دعائیں کرتا ہے۔

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا	اے ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے اہل و عیال کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک بخش اور ہمکو پرہیزگاروں
(الفرقان ۷۴)	کا امام بنا۔

اسکی نگاہوں میں اللہ و رسول کی یہ ہدایت ہمیشہ مستحضر رہتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ	اے ایمان والو! اپنے آپکو اور اپنے گھر والوں کو اس آگ سے بچاؤ جسکا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔
(التحریم ۶)	
اور كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ	تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور ہر شخص سے اسکی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔
(حدیث)	

اس کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ "ذهب إلى أهله يتمطى" جو جہنمی کی بدبختی کے جہاں اور اسباب

ہونگے وہیں ایک سبب یہ ہوگا کہ وہ اپنے گھر والوں کی طرف اکڑتا ہوا چل دیا
وہ اپنے بال بچوں کے درمیان انجام سے بے فکر ہو کر زندگی نہیں گذارتا ۔

إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ
(الطور ۲۶، ۲۷)

(مومنین اپنی کامیابی کی وجہ بتائیں گے کہ) ہم پہلے اہل و عیال کے باب میں اس سے پہلے ڈرتے ہی ہوتے رہے تھے تو اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذاب دوزخ سے محفوظ رکھا ۔

حضرت لقمانؑ جیسے حکیم نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی تو کیا نصیحت کی

وَإِذْ قَالَ لُقْمَانُ لِابْنِهِ وَهُوَ يَعِظُهُ يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ... يَا بُنَيَّ إِنَّهَا إِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِي صَخْرَةٍ أَوْ فِي السَّمَاوَاتِ أَوْ فِي الْأَرْضِ يَأْتِ بِهَا اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ لَطِيفٌ خَبِيرٌ يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۔ (لقمان ۱۳، ۱۶ تا ۱۹)

یاد کرو جب لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا تھا اس نے کہا بیٹا اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا بیشک شرک بڑا ظلم ہے ...... اے میرے بیٹے اگر کوئی چیز رائی کے دانہ برابر بھی ہو اور کسی چٹان میں یا آسمانوں یا زمین میں کہیں چھپی ہوئی ہو، اللہ اسے نکال لائے گا۔ وہ باریک بین اور باخبر ہے، بیٹا! نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بدی سے منع کر، اور جو مصیبت بھی پڑے اس پر صبر کر یہ وہ باتیں ہیں جن کی بڑی تاکید کی گئی ہے اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر، نہ زمین میں اکڑ کر چل، اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے کو پسند نہیں کرتا، اپنی چال میں اعتدال اختیار کر، اور اپنی آواز پست رکھ سب آوازوں سے زیادہ بری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے ۔

حضرت اسمٰعیلؑ اپنے گھر والوں کو کس بات کی تلقین کیا کرتے تھے ۔

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ
(مریم ۵۵)

وہ (اسمٰعیلؑ) اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تلقین کیا کرتا تھا ۔

حضرت یعقوبؑ کی موت کا وقت جب قریب آیا ہے تو انہیں اپنی اولاد کی فکر دامنگیر ہوئی لیکن کس بات کی ؟

أَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِنْ بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (البقرۃ ۱۳۳)

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا جبکہ اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آبا و اجداد ابراہیم، اسمٰعیل اور اسحٰق کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

یعقوبؑ کی اولاد مومن تھی، ایک خدا کو ماننے والی تھی، اسی کی عبادت کیا کرتی تھی لیکن اس کے باوجود انہیں اپنی موت کے وقت سب سے زیادہ اسی بات کی فکر ہوئی کہ انکی اولاد ان کے بعد خدا سے غافل نہ ہو۔ انسان مرتے وقت کیا کیا نصیحتیں کرتا ہے۔ اس کے دل میں کیا کیا ارمان ہوتے ہیں۔ یعقوبؑ بھی اپنے سینہ میں دل رکھتے تھے، وہ دل جو اپنے اندر احساس و شعور کی دھڑکنیں رکھتا تھا لیکن انہیں زندگی کے آخری لمحات میں بس بچوں کی عاقبت کا خیال آیا۔ اور انہوں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اس بات کا اطمینان کر لینا چاہا کہ انکی اولاد خدا کی بندگی، اسکی غلامی اور اسکی اطاعت سے غافل نہیں ہونے پائے۔

اس وقت ہمارا انتہائی توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ اپنی نئی نسل کو تہذیبی یلغار سے محفوظ رکھتے ہوئے ان کی دینی شناخت کو کیسے باقی رکھیں اور ان کے دین اور عقیدہ کی کس طرح حفاظت کریں۔ اس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا مسئلہ دینی شناخت کا تحفظ ہے۔ اکابرین ملت کو اس کے لئے کوئی مشترکہ لائحہ عمل تجویز کرنا اور کوئی متحدہ موقف اختیار کرنا ہوگا۔

کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان جمہوری ملک ہے، جمہوری ملکوں میں تعداد کی اہمیت

سے انکار نہیں کیا جا سکتا تعداد بڑھانے کے دو ہی طریقے ہیں ایک تبلیغ اور دوسرا تناسل حضورؐ کا ارشاد ہے۔ تزوجوا الودود الولود فانی مکاثر بکم الامم (مسند احمد) بہت زیادہ بچے دینے اور محبت کرنے والی عورت سے شادی کرو کیونکہ دوسری قوموں سے تمہاری کثرت پر فخر کروں گا۔ تعدد ازدواج بھی بہت سارے مسائل کا حل ہے۔ اس کے لیے ایک شکل یہ اختیار کی جا سکتی ہے کہ زیادہ عمر تک نکاح کو ٹالا نہ جائے بلکہ اس میں جلدی کی جائے لیکن یہ بات جاننی رہے کہ مطلق سروں کی گنتی سے کچھ نہیں ہوتا۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ وہ سر کسی لائق ہوں بلند ہمت اور باحوصلہ ہوں اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں۔ جسمانی اور روحانی اعتبار سے مضبوط و توانا ہوں، دوسروں کے لیے سہارا نہیں، بوجھ نہ ثابت ہوں جمہوریت میں عددی برتری اپنی جگہ لیکن پھر بھی امر واقعہ یہ ہے کہ حکومت ہمیشہ علم اور قوت کی بنیاد پر کی جاتی ہے پوری انسانی تاریخ اس پر گواہ ہے، طاقت کا سرچشمہ علم ہے۔ آج دنیا میں جن لوگوں کا سکہ چل رہا ہے وہ علم میں بڑھے ہوئے ہیں، حکومت و فرمانروائی کے لیے تعداد کی کثرت ضروری نہیں ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ حکومت اقلیت کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ لیکن ایسی اقلیت جو علم اور طاقت میں دوسروں سے فائق اور ممتاز ہو۔ لوگوں کو اکثریت اقلیت کے الفاظ سے دھوکا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان جب فرمانروائی اور تاج و تخت کے راستوں سے داخل ہوئے تو کیا وہ یہاں کی آبادی سے تعداد میں بڑھ کر تھے؟ یا انگریزوں نے مسلمانوں کو جب اقتدار سے محروم کیا تو کیا ان کی تعداد زیادہ تھی۔ دنیا کے دوسرے ملکوں پر نگاہ ڈالیے خود ہندوستان کو دیکھ لیجیے ایک مختصر اور چھوٹے سے طبقہ کے ہاتھ میں ہر جگہ حکومت ہے۔ حکومت کے مناصب ہوں، یا سیاسی، سماجی اور مذہبی تنظیمیں، ہر جگہ اقتدار پر نیچے سے اوپر تک مخصوص قلیل التعداد طبقہ کا قبضہ ہے۔ انتخابی نتائج بھی یہی بتاتے ہیں کہ اکثریت کی پسند نہ ہونے کے باوجود ایک پارٹی اقتدار پر پہونچ جاتی ہے، جسے عوام کی بہت تھوڑی نمائندگی حاصل ہوتی ہے۔ لوگوں کی نگاہیں میدان جنگ کے سپاہیوں اور جرنیلوں پر مرکوز ہوتی ہیں۔ وہ ان کارخانوں کو نہیں دیکھ پاتے جہاں سے یہ سپاہی اور جرنیل ڈھل کر اور تیار ہو کر آتے ہیں۔ میدان جنگ سے پہلے یہ جنگ مدارس و مکاتب میں لڑی جاتی ہے، یہ وہ تربیت گاہیں ہوتی ہیں جہاں یہ پرزے ڈھلتے اور ان کا ذہنی سانچہ تیار ہوتا

ملک کا نظام ایسا ہو، اسی کا نتیجہ [illegible] پورے ملک میں [illegible] کے مکاتب اور انکی شاکھاؤں میں ہوئی ہے، ہمارے [illegible] سکتے ہیں۔ اس کے لیے علمی گہرائی، کردار کی پختگی اور شاہینی صفات درکار ہیں۔ یہ صفات اپنے باہمی اختلافات بھلا کر، موزوں، متوازن، اور وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نظام تعلیم اور نظام تعلیم کے ساتھ طلبہ، اساتذہ اور کارکنان مدارس کی شب و روز محنت سے پیدا ہونگی۔ یہ جنگ دراصل ان کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جیت سکتا۔

نسلی برتری، نفرت اور انتقام در انتقام کی وہ آگ جس کے شعلے ساری اعلیٰ قدروں کو بھسم کیے دے رہے ہیں، جس سے ملک کا کوئی خطہ اب محفوظ نہیں رہا اور جس کی زد میں سب سے زیادہ مسلمان ہیں، یہ آگ پٹرول ڈالنے سے نہیں بجھے گی۔ اس کے لیے پانی فراہم کرنا ہوگا۔ یہ کام طویل المیعاد منصوبہ بندی اور گہری حکمت عملی کا متقاضی ہے۔ داخلی اور بیرونی دونوں محاذوں کے استحکام کے لیے ضروری ہوگا کہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت اور دین سے رشتہ مستحکم و استوار کرنے کو اولیت دی جائے۔ اس کے لیے ہمارے تعلیمی ادارے ہماری توجہ کے محتاج ہیں۔ ہمیں ان کا معیار اونچا کرنا ہے اور ہر ممکن طریقہ سے انکی دستگیری اور دیکھ بھال کرنی ہے

دوسرا فوری توجہ طلب مسئلہ یہ ہے کہ ہم دعوت کے محاذ پر اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ ہم نے اس ضمن میں مجرمانہ تغافل برتا ہے۔ خدا کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے ہم اس کے امین اور پاسباں ہیں، دنیا کے مسائل جو پیچیدہ ہوئے ہیں اور خود ہماری گتھیاں جو الجھی ہیں اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ ہم نے اس کتاب کی شہادت کا حق ادا نہیں کیا، لوگ اوہام و خرافات اور دیومالائی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں۔ انتہا پسند سیاست کے چودھری اس بات کو خوب سمجھتے ہیں، انہیں معلوم ہے کہ ان کا کون سا پہلو کمزور ہے وہ کردار اور دلیل کی قوت سے غیر مسلح ہیں انکی ساری عمارت پروپیگنڈے پر قائم ہے اس لیے وہ نہیں چاہتے کہ ہم دعوت کے محاذ پر جمنے پائیں، وہ ہمیں بار بار میدان

جنگ بھی مسلط کرنا چاہتے ہیں، ہماری حکمت عملی یہ ہونی چاہئے۔ یہ دین کا بھی تقاضا ہے اور اس میں ہماری بھی بہبود ہے کہ ہم انہیں دعوت کے میدان میں کھینچ لائیں۔ اور دعوت کے محاذ کو محاذ جنگ میں بدل دیں۔ اخلاق کی بلندی، محبت و پیار، ایثار و خلوص اور حکمت و موعظت، خاموش اور مثبت انداز میں، اشتعال اور ہنگاموں سے بچ کر، توحید و رسالت، آخرت کی بات پورے اعتماد کے ساتھ شروع کریں۔ کفر و شرک، اونچ نیچ، چھوت چھات اور نسلی تفاخر کے نظام کو موضوع بحث بنائیں۔ یہ کام گہرے عزائم، ایک دوسرے سے قربت اور ایک دوسرے کی غیر معمولی خیر خواہی چاہتا ہے۔ اس کے لئے جہاں بہت کچھ کھونا ہوگا وہیں ریلیوں اور مظاہروں سے، نعروں اور اشتعال انگیز بیانات سے ممکن حد تک بچنا ہوگا۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دعوت کا کام کرنے والے نرم چارہ بن جائیں کہ جو چاہے نگل لے، انہیں مضبوط اور توانا ہونا چاہئے۔ ان کے اندر مومنانہ فراست ہونی چاہئے، انکے بازو حضرت موسیٰؑ کی طرح فولادی ہوں۔ جب دعوت و تبلیغ یا درس و تدریس کی بات آتی ہے تو لوگوں کے ذہن میں یہ تصویر ابھرتی ہے کہ کمزور لاغر ناتواں شخص ہے جو نہ دوڑ سکے نہ بھاگ سکے، ہوا لگنے سے گر جائے، ہولی کے پتے پر پاؤں پڑیں تو چھینک آ جائے۔ یہ غلط تصور ہے۔ داعیان دین اور اساتذہ اور طلبہ کو اپنی یہ تصویر بدلنی ہوگی۔ انہیں چاہئے کہ جسمانی توانائی اور تربیت کی جانب بھی توجہ دیں۔ مختلف فنون حرب میں ماہرانہ صلاحیت پیدا کریں، اور یہ بات سامنے رکھیں کہ کوئی حکومت، کوئی پولیس یا کوئی تیسرا ان کا محافظ نہیں۔ ان کا اصل محافظ خدا ہے۔ کل بھی تھا، آج بھی ہے، آئندہ بھی رہے گا۔ اللہ پر توکل اور بھروسہ کرتے ہوئے انہیں اپنا تحفظ خود کرنا ہے۔

بعض مسلمان اس پہلو سے سوچنے لگے ہیں کہ منتشر مسلم گھرانے مسلم اکثریتی علاقہ میں منتقل ہو جائیں۔ ان آندھیوں کے تیور اچھے نہیں ہیں۔ دوسرے یہ کہ مسلمان اسلامی شناخت کا اہتمام کریں۔ انکی ہیئت اور وضع قطع ایسی ہو کہ وہ مسلمان معلوم ہوں۔ دیکھنے والا پہچان لے کہ یہ مسلمان ہیں۔ مسلمان کم و بیش بیس فیصد ہیں، ہر جگہ تقریباً یہی تناسب رہتا ہے، شناخت نہیں ہونے کی وجہ سے اگر کسی ٹرین یا بس میں کسی مسلمان پر حملہ ہوتا ہے

تو وہ غریب یہ سمجھتا رہتا ہے کہ تنہا میں مسلمان ہوں، اور اس کے علاوہ دوسرے مسلمان اپنی جگہ پر الگ الگ اپنے کو تنہا سمجھ رہے ہوتے ہیں جس سے حملہ آوروں کو حوصلہ ملتا ہے اور حملہ کا شکار حوصلہ ہار بیٹھتا ہے۔ لیکن اگر اسلامی شناخت کا اہتمام ہو تو ہر جگہ ان کی ایک قابل لحاظ تعداد ہوگی جسے ایک دوسرے سے تقویت ملے گی اور شرپسندوں کو آسانی سے جرأت نہیں ہو سکے گی۔

سوچنے کا یہ انداز اور یہ مشورہ قابل قدر اور قابل غور ہے، لیکن سب سے زیادہ بنیادی چیز تعلیم اور دعوت ہے۔ علم صحیح سے مسلح ہونا، زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کو اپنانا کسی وقتی مصلحت کی خاطر نہیں، اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کیلئے، دنیا اور آخرت کی رسوائی اور جہنم کی آگ سے بچنے کے لئے ظاہر و باطن ہر پہلو سے مسلمان بننا، وضع قطع اسلامی بنانا، مومنانہ کردار اور مومنانہ شان کا حامل ہونا اور قولی اور عملی ہر دو پہلو سے اللہ کے بندوں کے سامنے حق کی گواہی دینا، انہیں ان کے رب کریم کا راستہ دکھانا، دراصل یہی ہمارے مسائل کا پائیدار حل اور دنیا اور آخرت کی کامیابی کا ضامن ہے۔

مدارس دینیہ کا تعلیمی سال ختم ہو رہا ہے۔ اس موقع پر اساتذہ، طلبہ اور کارکنان مدارس کو تھوڑی دیر رک کر اپنا احتساب کرنا چاہئے کہ ان سے کس پہلو سے کیا کوتاہی ہوئی ہے تاکہ آئندہ وہ اسکی تلافی کر سکیں۔ اس طویل چھٹی کے موقع پر اگر وہ اپنے علاقہ میں مندرجہ بالا باتوں کی جانب خصوصی توجہ دیں تو بہتر ہوگا۔ وہ اپنے بھائیوں کو بتائیں کہ دین کی بعض باتوں پر عمل کرنا اور بعض کو نظر انداز کر دینا کتنا سخت جرم اور عاقبت کے لحاظ سے کتنا نقصاندہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کہا تھا۔

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَ
تَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَفْعَلُ
ذَٰلِكَ مِنْكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ
أَشَدِّ الْعَذَابِ (البقرہ ۸۵)

کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور
اس کے دوسرے حصے کا انکار کرتے ہو جو لوگ تم
میں سے ایسا کرتے ہیں انکی سزا دنیا کی زندگی میں
رسوائی کے سوا اور کچھ نہیں اور آخرت میں وہ شدید
ترین عذاب کی طرف بھیجے جائیں گے۔

ہے اور وہ انہیں اس بات پر آمادہ کریں کہ اپنے مسائل ادھر ادھر لے جانے کے بجائے وہ شرعی پنچایتوں کے حوالہ کریں اور اپنا معاملہ خود حل کریں، اسراف اور فضول خرچی سے بچیں، افتراق و انتشار کی ہر کوشش کا سختی سے نوٹس لیں اور ہر نیک کام میں تعاون کریں۔ انکی بستی کا ایک بچہ بھی تعلیم سے محروم نہیں رہے۔ اسلام کو اپنے لئے سعادت اور افتخار کی چیز سمجھیں۔ اسکے اظہار سے شرمائیں یا ڈریں نہیں اور سب مل کر اللہ کے آگے اجتماعی طور پر گر جائیں، توبہ و استغفار کریں اور اپنے گرم گرم آنسوؤں سے اللہ تعالیٰ کو منائیں۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا	اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے
وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ	اگر تو ہماری مغفرت نہیں کرے گا اور ہم پر رحم نہیں
(اعراف ۲۳)	فرمائے گا تو ہم یقیناً گھاٹا پانے والوں میں سے ہوں گے

بقیہ قوم عاد کے آثار ۔۔۔۔۔

(‏[illegible])
"پس وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے مساکن کے سوا کسی بھی چیز کا نشان باقی نہیں رہا۔"

قرآن کا یہ بیان اب تک قرآن کو ماننے والوں کے لئے ایک طرح کی پریشانی کا سبب بن سکتا تھا، اعتراض کرنے والے کہہ سکتے تھے کہ کہاں ہیں ان کے مساکن کے آثار ۔۔۔۔ لیکن اب یہ نہیں کہا جا سکتا۔ □

فارم ۴

ماہنامہ مجلہ حیات نو

مقام اشاعت:	بلریا گنج اعظم گڑھ
وقفہ اشاعت:	ماہنامہ
مالک:	انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ
پرنٹر و پبلشر:	نور محمد، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ
ایڈیٹر:	نور محمد، جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ

میں نور محمد پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا وضاحتیں میرے علم و اطلاع کے مطابق صحیح ہیں۔

نور محمد

مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کے مسائل اور ان کا حل

مولانا صدرالدین اصلاحی

(۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء کو آل انڈیا جماعت اسلامی کے کل ہند اجتماع منعقدہ حیدرآباد کے موقع پر "ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی اکائیوں کے بنیادی مسائل" کے موضوع پر اس وقت کے حالات کے اعتبار سے ایک سمپوزیم منعقد کیا گیا جس میں ملک کی سربرآوردہ جماعتوں کے رہنماؤں نے حصہ لیا۔ یہ سمپوزیم مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند کی صدارت میں منعقد ہوا۔ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی رکن شوریٰ نے اس موضوع پر جو مقالہ پڑھا اسے افادۂ عام کی غرض سے ذیل میں شائع کیا جا رہا ہے۔)

حضرات! ہر فرد کی اپنی ایک مخصوص شخصیت ہوتی ہے۔ وہ بعض امتیازی خصوصیات رکھتا ہے جن سے اسکی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔ یہی انفرادیت اسکی ذات کو ممتاز اور نمایاں کرتی ہے اور اسی پر اس کا ذاتی تشخص موقوف ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنی اس مخصوص شخصیت اور ان امتیازی خصوصیات سے محروم ہو رہے یا اس کو ان سے جبراً محروم کر دیا جائے تو گویا اسے اپنے آپ سے محروم کر دیا گیا اور اسے ایک دوسری شخصیت اڑھا دی گئی۔ اسی وجہ سے مہذب سماج کا یہ بنیادی وصف مانا گیا ہے کہ اس کے اندر انسان کی انفرادیت باقی رہے اور اسے اپنے طور پر پروان چڑھنے کی معقول آزادی حاصل ہو اور اس آزادی میں کوئی رکاوٹ نہ حائل ہونے دی جائے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ایک سیاسی نظام اور ایک حکومتی ادارے کے قیام کی بنیادی غرض و غایت ہی اس آزادی کا تحفظ ہے۔ چنانچہ جب بھی کسی آمرانہ نظام نے لوگوں کے اس سب سے اہم بنیادی حق پر کوئی پابندی عائد کر دی تو انسانی ضمیر اسے کبھی برداشت نہ کر سکا اور اس کے خلاف برابر بغاوت میں لگا رہا۔

یہ بات جس حد تک افراد کے حق میں ایک مسلمہ ہے، قوموں ملتوں اور تہذیبی گروہوں

کے بارے میں اس سے بڑا گناہ اہم تر اور عظیم تر مسئلہ ہوگی۔ اتنا ہی اہم تر اور منظم تر جتنا کہ ایک پورا گروہ ایک فرد کے مقابلہ میں ہوا کرتا ہے۔ مذہبی اور تہذیبی گروہوں کی اپنی انفرادیت بھی تو ان کی اصل متاع ہوتی ہے۔ وہ فی الواقع اسی وقت تک زندہ اور موجود ہوتے ہیں جب تک کہ ان کا تشخص برقرار رہتا ہے۔ ان کے اپنے اصول انکی عام زندگی کی رہنمائی کر رہے ہوتے ہیں اور انہیں اپنے مخصوص تصورات کے مطابق اپنے حال اور مستقبل کی تعمیر کی آزادی حاصل ہوا کرتی ہے۔ اس تشخص کا فنا یا مضمحل ہو جانا اور ان اصول و تصورات کا ان کی زندگی کے میدان سے بے دخل کر دیا جانا در اصل ان تہذیبی اکائیوں کا خاتمہ ہو جانا ہے۔ اس لئے کسی مذہبی یا تہذیبی گروہ کے لئے بنیادی اور اصل مسئلہ صرف ایک ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنے تہذیبی تشخص اور اپنی زندگی کی دینی بنیادوں کو پوری طرح محفوظ رکھنے میں ہر خوف اور ہر خطرے سے آزاد ہو، اور ان کے مطابق اپنے مستقبل کی تعمیر میں اسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

تہذیب کشی اور اسکا انجام بد

جب مذہبی آزادی اور تہذیبی حق خود اختیاری کا انسانی زندگی میں یہ مقام ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس آزادی کی نفی اور ان حقوق کا انکار دنیا کا سب سے بھیانک ظلم ہوگا۔ ایک انسان کے قتل کو سب سے بڑے جرائم میں شمار کیا جاتا ہے۔ تہذیب کشی تو ایک پورے گروہ اور ایک پوری ملت کا معنوی قتل ہے۔ اس لئے کوئی شک نہیں کہ اس ظلم کی ہولناکی اپنی مثال آپ ہی ہو سکتی ہے

لیکن معلوم رہنا چاہئے کہ اس ظلم اور خون ناحق کی تلوار بھی دو دھاری ہوتی ہے۔ جب وہ چلائی جاتی ہے تو مظلوم ہی پر نہیں ظالم پر بھی گرتی ہے۔ واضح بات ہے کہ ظلم کی جو چھری وہ کسی دوسری گردن پر چلانے بڑھتا ہے وہ قبل اس کے کہ وہاں تک پہنچے خود اس کے اپنے ضمیر اور اسکی اپنی انسانیت پر کاری ضرب لگا چکی ہوتی ہے۔ ایسی حرکتوں کے نتیجے میں اسکی ذہنیت سخت ناہموار اور اسکی اخلاقی حس پامال ہو رہی ہے۔ اسکے ضمیر میں تنگ نظری اور اسکے مزاج میں بربریت گھر کر لیتی ہے اسکا کھلا ہوا مطلب یہی تو ہوا کہ دوسروں کو تباہ کرنیوالا اپنے کو بھی اخلاقی تباہی کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے۔

جماعت افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ اس لئے جو بات ایک فرد کے بارے میں حقیقت ہوگی وہ جماعت کے بارے میں بھی حقیقت ہی ہوگی۔ لہذا اگر کوئی جماعت کسی دوسری

جماعت کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کی اور کوئی ملت کسی دوسری ملت کی تہذیب اور اسکے مذہب کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کرتی ہے تو اسکا مطلب یقینی طور پر یہی ہے کہ وہ اپنے کو حق دشمنی، شر پسندی، ظلم اور غارت گری کی ٹریننگ دے رہی ہے۔ حالانکہ حق دشمنی اور ظلم و غارت گری جہاں ہوتی ہے وہاں سے تہذیب رخصت ہو جاتی ہے اور تہذیب دم توڑ دیتی ہے۔ اس لئے کسی قوم کی تہذیب کشی انجام کے اعتبار سے خود کشی بھی ہے۔ دوسرے مذہبوں اور تہذیبوں کے خلاف جارحیت اختیار کرنے والے خود اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کے بھی جانی دشمن ثابت ہوتے ہیں، اور یہ اس لئے کہ جب کسی گروہ کو ظلم و تعدی کا چسکا پڑ جاتا ہے تو وہ کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ جب تک دوسرے سامنے موجود ہوتے ہیں اس وقت تو انکی جان و مال اور انکی تہذیب و مذہب کا خون اس کے ذوق خون آشامی کو تسکین دیتا رہتا ہے، مگر جب دوسرے موجود نہیں رہ جاتے یا ان کی رگیں خشک کی جا چکی ہوتی ہیں تو فطری طور پر انکی اس سفاک ذہنیت کا رخ اپنوں ہی کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس طرح ظلم و بربریت کی یہ آگ جب کھانے کے لئے کچھ اور نہیں پاتی تو خود اپنے ہی کو کھانے لگتی ہے۔

ہندوستان اور اسکی دو حیثیتیں

ہم جس ملک کے باشندے ہیں اسکی حدود ہی میں تھوڑی نہیں ہیں بلکہ اسکی برادری بھی بڑی ہے۔ یہاں دنیا کے سارے بڑے مذاہب موجود ہیں اور یہ زمین مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے۔ دنیا کی زندگی کے مسائل کی زندگی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے کہ یہاں بھی ہر مذہب کے پیروؤں اور ہر تہذیب کے علمبردار گروہ کے لئے مسائل کا پایا جانا ایک قدرتی بات ہے۔ ان مسائل کا اگر تجزیہ کیجئے تو وہ دو قسم کے دکھائی دیں گے۔ ایک قسم ان مسائل کی ہوگی جو ان گروہوں میں سے صرف اقلیتی گروہوں کے مخصوص مسائل ہیں۔ اور دوسری ان مسائل کی ہوگی جو عام اور ہمہ گیر نوعیت کے ہیں اور ان سے صرف دینی اقلیتیں دوچار نہیں جو اقلیت میں ہونے کے باعث سیاسی دشواریوں میں گھری ہوئی ہیں بلکہ اس اکثریتی گروہ کے لئے بھی یہ مسائل برابر کی اہمیت رکھتے ہیں جو سیاسی حیثیت سے بالادست اور اپنے دینی اور تہذیبی معاملہ میں

کسی بھی بیرونی دباؤ یا خوف سے یکسر آزاد ہے۔

مشترک مسائل

ان مسائل میں سے جو اس ملک کی سبھی ملتوں اور تہذیبی گروہوں کو درپیش ہیں، چند مسائل بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے اس وقت میں انہی پر روشنی ڈالوں گا۔

پہلا مسئلہ وہ مادی ذہنیت ہے جو آندھی طوفان کی طرح اس ملک کے باشندوں پر چھائی چلی جا رہی ہے، اور جس نے یہاں مذہبی اور روحانی اقدار کی جڑیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ یہ ذہنیت بنیادی طور پر مغربی تہذیب کے قاہرانہ تسلط کا نتیجہ ہے۔ اس تسلط کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس وقت ملک کی سیاسی سربراہی پر اسی کی گرفت سب سے سخت ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں یہاں کی فکری رہنمائی اور اجتماعی لیڈرشپ ہے وہ بالعموم اسی مغربیت کے اندھے مرید ہیں۔ حتی کہ ان میں سے اکثر تو اس کی آخری حد، الحاد و انکار مذہب تک جا پہنچے ہیں۔ جب تک یہ صورت حال باقی رہے گی یہاں کے ہر مذہب اور تہذیب کے لئے مسائل ہی مسائل پیدا ہوتے رہیں گے اور ان کا مستقبل کبھی روشن نہ ہو سکے گا۔

دوسرا مسئلہ نظام تعلیم کا ہے۔ برطانوی دور حکومت میں یہاں تعلیم کا جو نصاب اور نظام جاری کیا گیا تھا وہ اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں کے ساتھ آج بھی بدستور موجود ہے۔ اس نظام تعلیم پر جو بھی اپنے مذہب، اپنی اخلاقی اقدار اور اپنی تہذیب کے نقطۂ نظر سے غور کرے گا وہ اپنے حق میں اسے سم قاتل ہی پائے گا۔ اس تعلیم کی خالص سائنسی برکتیں اپنی جگہ پر لاکھ قابل قدر سہی مگر اس کے اندر خون کی طرح دوڑنے والی افکار سے قطعی طور پر اپنے خدا سے، اپنے مذہب سے، اپنی اخلاقیات سے، اپنی روحانی اقدار سے اور اپنے تہذیبی مزاج سے دور پھینک دینے والی ہے۔ چنانچہ جس حد تک بھی یہ نظام تعلیم ہماری نسلوں کو اپنے سانچے میں ڈھالتا گیا ہے، یہاں کے مذاہب کی اور یہاں کی تہذیبوں کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی چلی گئی ہیں۔ قطعی بات ہے کہ یہ نامبارک سلسلہ اگر آئندہ بھی جاری رہا تو اس کے یہ نتائج اور زیادہ مہلک ہوتے چلے جائیں گے۔

تیسرا مسئلہ اہل مذاہب کا اپنی مذہبی تعلیمات اور اپنے تہذیبی اصولوں سے بے اعتنائی

کا خوفناک رویہ ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ ملک خدا پرستی اور روحانیت کا گہوارہ ہے۔ فطری اور روایتی طور پر یہ دعویٰ چاہے جتنا بھی صحیح ہو مگر عمل کی کسوٹی اس دعوے کو کھوٹا ہی کھوٹا قرار دیتی ہے۔ وہ یہاں تک بتاتی ہے کہ بعض پہلوؤں سے اس "مذہبی اور روحانی" ملک کا حال مادہ پرست مغرب سے بھی ابتر ہے۔ چنانچہ اپنے کاروباری اور قومی معاملات میں جن اخلاقیات کی پابندی کا وہ مظاہرہ کر رہا ہے ہمارا ملکی معاشرہ نوے فی صدی اس سے بھی محروم ہے۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ ایک قلیل عنصر کو چھوڑ کر باقی پورا سماج، ادھر... خود غرضی اور نفس پرستی میں بری طرح غرق ہے اور انہی صفات میں سابقت کر رہا ہے۔ اگرچہ ساتھ ہی وہ اپنے مذہب کا نام بھی بڑے جوش عقیدت سے لیتا رہتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ مذہب کی تعلیمات اور تہذیب کے اصولوں کی کھلی ہوئی عملی مخالفت کے ساتھ ان کے حق میں یہ زبانی اظہار عقیدت ایک لطیف مذاق سے کم نہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ جو پارٹیاں اور تنظیمی ادارے اپنے دعوے کے لحاظ سے مذہب اور تہذیب کی حفاظت و ترقی ہی کے لئے وجود میں آئی ہیں۔ اور انہی نے ہاتھوں پر دن رات دھرم اور سنسکرتی ہی کے نام رہا کرتے ہیں، ان کے رویے اور مشاغل میں بھی دوسروں سے نفرت، دوسروں کے خلاف عداوت ہی کا زور شور سرفہرست رہتا ہے۔ کم از کم بیرونی حلقوں میں تو وہ اسی حیثیت میں جانی پہچانی جاتی ہیں۔ تہذیب کے نام پر فی الواقع یہ افسوسناک قسم کی بدتہذیبی اور مذہب کے نام پر فی الواقع یہ افسوسناک قسم کی مذہب دشمنی ہے۔ جس سے تہذیب اور مذہب کا مستقبل صرف تاریک تر ہی ہو سکتا ہے۔ یقین رکھئے کہ یہ متعفن تہذیب نوازی اور یہ بگڑی ہوئی مذہبیت مذہب کے خلاف آج ملحدوں اور منکروں کا سب سے کارگر ہتھیار بنا ہوا ہے۔ یہ روش دین و دیانت کے خلاف ایسی ناطق دلیل ہے جس کے ہوتے ہوئے یہاں مذہب بیزاری اور مادہ پرستی کو اپنے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔ مذہب کے نادان اور نام نہاد پیروؤں کے ان سیاہ کارناموں کو وہ عوام کے سامنے پیش کر کے انہیں بڑی آسانی سے مذہب سے متنفر بنا سکتے اور انہیں اپنی صف میں لے جا کر کھڑا کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

چوتھا مسئلہ مذہب کے پیروؤں اور تہذیب کے علم برداروں کا فکری جمود اور

ان کی ذہنی مرعوبیت ہے۔ جو چھوٹا سا گروہ اہل مذہب کا اس بے عملی کے روگ سے بچا ہوا ہے اور مذہب کی مخلصانہ پیروی اور دینی تہذیب کی صدق دلانہ حفاظت اور ترقی کا سچا جذبہ رکھتا ہے اس کا بھی حال بالعموم یہ ہے کہ وہ سینکڑوں اور ہزاروں برس کی پرانی دنیا میں رہ کر سوچتا ہے اور اس کی ذہنی گھڑی ابھی تک ٹھہری ہوئی ہے۔

بہرحال اس فکری پسماندگی کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نکل ہی نہیں سکتا تھا کہ ان کا دین عبادت خانوں میں بند رہے اور دینی تہذیب زمانے کی رہنمائی کرنے کے بجائے اس کے پیچھے چلتی بلکہ گھسٹتی رہے۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ خود یہ اہل مذہب اب عموماً یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مذہب کا دنیا کے معاملات سے اور انسان کی فکری، عملی اور تمدنی رہنمائی سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کا کام تو انسان کو بس ایک "روحانی تسکین" بہم پہنچانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کا ایک کامیاب اور زندہ نظام بنائے رکھنے کے خیال تک سے محروم ہو چکے ہیں۔ اور یہ سب کچھ نتیجہ ہے مذہب کی پاکیزہ روح اور اس کے بلند مقاصد سے دوری اور اس کی حقیقی توانائیوں سے بے خبری کا۔ اس بے خبری کے ہوتے ہوئے ان کے مذہب اور تہذیب کا مستقبل کبھی نہیں سنور سکتا ہی نہیں بلکہ یہ تہذیب نت نئے صدموں سے دوچار ہوتی رہے گی۔

(۲) اقلیتی گروہوں کے مخصوص مسائل

ان عام اور ہمہ گیر مسائل کے علاوہ دوسرے مسائل جو یہاں کے بعض اقلیتی گروہوں کو خاص طور سے درپیش ہیں، یہ ہیں۔

پہلا مسئلہ یہاں کے اکثریتی گروہوں کے اندر پائے جانے والے ایک ایسے طاقتور عنصر کا وجود ہے جو بعض اقلیتی گروہوں خصوصاً مسلمانوں کی مذہبی انفرادیت اور ان کے تہذیبی تشخص کو مستقلاً نشانہ بنائے ہوئے ہے۔ اور جس کی اس جارحانہ روش کے خلاف اس گروہ کے اچھے اور انصاف پسند لوگ بھی بڑی حد تک بے بس بنے ہوئے ہیں۔ ان عناصر کو اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کی حفاظت و ترقی سے اتنی گہری دلچسپی نہیں ہے جتنی کہ دوسروں کے مذاہب اور ان کی تہذیبوں کی بیخ کنی سے ہے۔ انہیں اس بات پر غم اور غصہ کم ہے کہ ان کے پرسنل لا میں خود انہیں کے اپنے نمائندوں کی کثرت رائے سے تبدیلیاں کیوں کر دی گئیں، بلکہ غصہ اس بات

پر زیادہ ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لا کو ابھی تک کیوں نہیں بدل ڈالا گیا۔ انہیں تعیش کے سامانوں کی درآمد پر برباد ہونے والے زرمبادلہ کا اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ اسلام کے ایک رکن حج کی ادائیگی پر صرف ہونے والے زرمبادلہ کا ہوا کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ضمیر پر انتہائی سخت قسم کے پہرے بٹھا دیئے ہیں۔ ورنہ اخلاقی موت کے منہ میں جا گرنے کے لئے وہ اتنی بے تابی کا مظاہرہ ہرگز نہ کرتے۔ بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر ایک دلچسپ مگر فی الواقع انتہائی افسوسناک واقعہ کا ذکر کر دوں۔ آزادی کے تین چار سال بعد جب بہار میں مسلمانوں کے خلاف انتہائی شدید قسم کے فسادات ہو رہے تھے۔ اس دوران اپنے ایک تعلیم یافتہ جن سنگھی دوست سے گفتگو کے دوران ہم نے یہ سوال اٹھایا کہ یہاں اب مسلمانوں کو رہنے دیا جائے گا؟ موصوف نے فوراً جواب میں فرمایا کہ اگر ایسا ہوا تو ہم ہندوؤں میں اور جانوروں میں فرق ہی کیا رہا! قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ اگلے ہی دن آر۔ ایس۔ ایس کے سب سے بڑے رہنما کا اخباروں میں یہ بیان آیا کہ ہندوستان سے مسلمانوں کو نکال دینا چاہئے۔ اب اندازہ کیجئے کہ جس ملت کے ساتھ ان کے بالادست ہم وطنوں کا طرز فکر اور رویہ اس حد تک مخاصمانہ ہو اس کے لئے ہندوستان "[illegible]" نہ بنا رہے گا تو اور کیا ہوگا۔

دوسرا مسئلہ خود موجودہ دستور حکومت کے کچھ اجزا خصوصاً اس کے بعض رہنما اصول ہیں۔ اس دستور کا یہ بڑا عجیب اور بڑا پر معنی تضاد ہے کہ ایک طرف تو وہ سماجی انصاف، مذہبی آزادی اور جمہوریت پسندی کے اونچے اصولوں اور حسین دعووں سے بھرا ہوا ہے۔ دوسری طرف اس میں مختلف مذہبی اور تہذیبی گروہوں کے شخصی قوانین تک کے وجود کو ناقابل گوارا ٹھہرا دیا گیا ہے اور ریاست کی یہ ایک بنیادی ذمہ داری قرار دی گئی ہے کہ وہ ملک کے تمام فرقوں اور ملی گروہوں کے لئے یکساں سول کوڈ بنا کر نافذ کرے۔ گویا مذہبی اور تہذیبی آزادی کا جو وعدہ اصولی طور پر اور گول مول انداز میں کر دیا گیا تھا، دستور کے اس رہنما اصول کے ذریعے اس کی ایسی تشریح کر دی گئی ہے جس سے وہ بڑی حد تک بے معنی ہو کر رہ گیا ہے۔ اس لئے کوئی شک نہیں کہ اس اصول کا اور اسی جیسی بعض دوسری دفعات کا دستوری وجود ملتوں اور تہذیبوں کے سر پر لٹکتی ہوئی ایک ایسی تلوار ہے جو انہیں کبھی اطمینان کا سانس نہ لینے دے گی۔

دستور کا یہ رہنما اصول اگرچہ اکثریت اور اقلیت میں کوئی امتیاز نہیں برتتا جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اکثریت کے لئے بھی اسی طرح ایک مسئلہ ہے جس طرح کہ اقلیتوں کے لئے ہے۔ لیکن یہ بات صحیح اسی وقت ہو سکتی تھی جب دستوری طور پر یہ ضروری قرار دیا گیا ہوتا کہ کسی بھی ملی گروہ کا پرسنل لا اس کے مستند نمائندوں ہی کی رائے سے بدلا جا سکے گا، ورنہ پارلیمنٹ کی عام اکثریت رائے سے یہاں اکثریت کے نمائندوں کا تناسب اسی فی صدی سے بھی زائد ہے۔ ایسی پارلیمنٹ اگر اپنی کثرت رائے سے اکثریتی پرسنل لا میں کوئی ترمیم کرتی ہے تو وہ بلاشبہ وہ خود اکثریت کے اپنے ہی نمائندوں کی رائے اور فیصلے کا نتیجہ ہوگا، جبکہ اقلیتی گروہوں کے بارے میں معاملے کی نوعیت بالکل دوسری ہوگی۔ اس لئے اس اصول کا وجود اگر ایک مسئلہ ہے تو صرف اقلیتی گروہوں کے لئے ہے، اکثریتی گروہ کے لئے ہرگز نہیں ہے۔

یہ شیطان کا سب سے بڑا کید اور دور حاضر کی سیاست کا سب سے بڑا فریب ہے کہ مذہب کا انسان کی مختلف اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور افسوس کہ مذہب کے خصوصی پیرو بھی اپنی کم نظری اور پست ہمتی کے باعث اس فریب کے بالعموم شکار ہو چکے ہیں۔ حالانکہ وہ مذہب مذہب نہیں جو مسائل حیات کے سلسلہ میں پوری پوری رہنمائی نہ دے سکے۔ اس لئے وقت کی یہ اہم ترین ضرورت ہے کہ مذہبی اور تہذیبی گروہ ذہنی مرعوبیت اور فکری جمود کی پستیوں سے باہر نکلیں زندگی کے مسائل کا سامنا کریں، تہذیبی بلندی نظری اور سیاسی سوجھ بوجھ سے آراستہ ہوں اور اخلاق اور خدا پرستی، نیکی و راست بازی، عدل و احسان کی صفات ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے ترقی پذیر تمدنی ثقافتی اور اجتماعی مسائل سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیتوں میں بھی اپنی برتری ثابت کر دیں۔ یہی وقت ہوگا جب کہ انکی زندگی کی زمام کار ان کے مذہبی اور تہذیبی اصولوں کے ہاتھ میں آسکے گی اور وہ اپنے مسائل پر آسانی کے ساتھ قابو حاصل کر سکیں گے۔ ورنہ مذہب کو عبادت خانے میں مقید اور تہذیب کو صرف چند رسموں تک محدود رکھنا اور باقی پوری زندگی کو کسی اور نظام فکر و عمل کے حوالے کئے رہنا مذہب اور تہذیب کے حق میں وہی نتیجہ پیدا کرتا رہے گا جو دو کشتیوں کی سواری کا انجام ہوا کرتا ہے۔ مسائل تو زندگی کے میدان میں پیدا ہوتے ہیں اور اسی طاقت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں جو وہاں برسرکار ہوا کرتی ہے۔ اس لئے اگر یہ طاقت کسی اور نظام فکر و عمل

کی ہوگی تو اس کے فیصلے مذہب کے حق میں نہیں اس کے خلاف ہی ہوا کریں گے۔ اور اگر وہ اپنی تگ و دو سے ایک مسئلہ حل کر پائے گا تو دو نئے مسئلے پیدا ہو چکے ہوں گے۔ اس لئے بالکل ضروری ہے کہ مذہب کی فکری قوت کو بھی برسرکار لایا جائے اور زندگی کے پورے نظم پر اس کی صالح سیادت قائم کر دی جائے۔

حضرات! اب اقلیتی گروہوں کے تینوں مخصوص مسائل کے حل کو لیجئے۔ پہلے یعنی اکثریتی گروہ کا فرض اس سلسلے میں یہ ہے کہ اس کے خیر پسند اور منصف مزاج افراد اپنے بے راہ ہم مذہبوں کی ساری غلط کاریوں اور ظالمانہ حرکتوں کا ذمہ دار خود اپنے آپ کو سمجھیں اور پھر انکی ذہنی اصلاح کی بھرپور اور جرأت مندانہ جدوجہد میں لگ جائیں، جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ کام جس طرح اقلیتی گروہوں کے مفاد میں ہے اسی طرح خود ان کے اپنے دھرم اور تہذیب کے بھی مفاد کا عین تقاضا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ اس کے ذریعے دوسروں کے مذہب اور تہذیب پر ہونے والے مظالم ہی کو نہ روک سکیں گے، بلکہ خود اپنی سنسکرتی اور اپنے دھرم کو بھی ان کے ناداں پیروؤں کے ہاتھوں سے داغدار بنا دیئے جانے سے بچا لیں گے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں متعدد مذہبی اور تہذیبی گروہ موجود ہوں، صحیح معقول اور منصفانہ بات صرف یہ ہوگی کہ تمام مذہبوں اور تہذیبوں کو اپنے اپنے طور پر آزادی کے ساتھ نشو و نما پانے کا موقع دیا جائے۔ ان کے درمیان حریفانہ کشمکش اور جارحانہ زور آزمائی کے بجائے صحت مند اور پرامن تعمیری مقابلہ ہو۔ اس طرح تجربے اور عمل کی کسوٹی پر ہر ایک کا کھرا کھوٹا آپ سے آپ نمایاں ہو جائے گا۔ جو کچھ کھوٹا ہوگا وہ خود بخود رد ہو کر رہ جائے گا۔ جو کھرا ہوگا وہ باقی رہے گا۔ یہی ملک کے مستقبل کے لئے بھی صحیح اور مفید ہے۔ یہی بنیادی انسانی حقوق کے بھی مطابق ہے۔ یہی تقاضائے انصاف بھی ہے اور حق بھی۔ یہی تہذیب کی اصل روح بھی ہے اور مذہب کی پسندیدہ راہ بھی۔ یہ تو ہوا اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں اکثریتی گروہ کا فرض۔ اقلیتی گروہوں کے کرنے کا کام اس سلسلے میں یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خود شناسی اور جرأت و عزیمت کے دو گونہ جوہر سے آراستہ کریں اور زندگی کا یہ راز ذہن میں بٹھا لیں کہ جینے کا حق ملا نہیں کرتا، حاصل کیا جاتا ہے۔ کوئی قوم یا ملت دوسروں کے احساس فرض

کے نتیجے میں مذہبی آزادی اور تہذیبی حق خود اختیاری سے بہرہ ور نہیں ہوا کرتی۔ اسی لئے یہاں کی اکثریت کا انسانی مذہبی اور تہذیبی فریضہ جو کچھ بھی ہو اور اس کے ادا کرنے کے بارے میں وہ چاہے جو رویہ بھی اختیار کرے، اقلیت کو اپنی جگہ یقین رکھنا چاہئے کہ اس کے مذہبی اور تہذیبی مستقبل کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا سرتاسر اس کے اپنے ہی عزم حیات، اپنی ہی جرأت اور اپنی ہی سرفروشی پر موقوف ہے۔ دوسروں کا احساس فرض اور دوسرے ذرائع و عوامل صرف مدد دے سکتے ہیں، اور یہ بھی اسی وقت ہوتا ہے جب حقیقی عامل یعنی اقلیت کا خود اپنا احساس فرض سرگرم کار ہو۔ یہ حقیقی عامل جیسا کہ عرض کیا گیا دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، ایک تو یہ کہ اس کے اندر خود شناسی موجود ہو، وہ جانتی ہو کہ اسے کیا کرنا چاہئے، اسے اس حقیقت کا علم ہو کہ اس کا دین اسے کس مقام پر اور کس حیثیت میں دیکھنا چاہتا ہے، دوسرے یہ کہ اسے جس مقام پر اور جس حیثیت میں ہونا چاہئے اس مقام اور اس حیثیت کو حاصل کر لینے کا اس کے اندر پورا عزم اور کامل یکسوئی موجود ہو۔ ان دونوں باتوں کا ثمرہ ہوگا کہ اسکی زندگی کا پورا رویہ بدل جائے گا، اس کے اندر سیرت کی بلندی، انسانیت کا درد، ہمدردی و غمخواری کا سوز، ایثار و قربانی کا جذبہ اور دلوں کو جیتنے کی امنگ پیدا ہوگی، وہ اپنے اصول حیات اور مقصد زندگی سے قریب آنے لگے گی، اس کے اندر عادلانہ بنیادوں پر قائم ہونے والی اجتماعیت اور صالح مقاصد پر مبنی یک جہتی پیدا ہونے لگے گی۔ مذہبی آن اور تہذیبی غیرت ابھرے گی اور اس کے تمام افراد اپنے ملی تشخص کو دل و جان سے عزیز رکھنے اور اس کی بقا و حفاظت کے لئے اپنی بہترین کوششیں صرف کر دینے پر آمادہ ہو جائیں گے اور یہ کوششیں بھی صحیح سمت میں ہوں گی۔ غرض کسی بھی ملت کی اندرونی توانائی کا ابھار ہی اس کے مسائل کے حل کی شاہ کلید ہے۔ اسی سے وہ آگ بھی بجھے گی جو اکثریتی گروہ کے جذباتی طبقے کی شعلہ مزاجیوں نے اس کے ارد گرد لگا رکھی ہے اور اسی سے وہ برف بھی پگھلے گی جو خود اس کے اپنے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔

دوسرے مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ مذہبی انفرادیت اور تہذیبی تشخص کا پورا پورا یقینی تحفظ حاصل کر لیا جائے اور اس غرض کیلئے دستور کی ان دفعات کو لازماً حذف کرا دیا جائے

جو ان انفرادیت اور تشخص کو ختم کرنے کی محرک بن رہی ہیں۔ دوسرے کاموں کی طرح یہ کام بھی یقیناً بڑا ہی دشوار ہے اور بڑی انتھک جد و جہد چاہتا ہے مگر ہمیں معلوم ہے کہ قوموں اور ملتوں کی انفرادیت انکی تہذیبی بقا اور اپنا مذہبی تشخص ایک قیمتی چیز ہے کہ اسکے لئے ہر کوشش کم اور ہر قربانی ہیچ ہے۔ یہی تشخص ان کا اصل سرمایہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس سے اونچی کوئی تدبیر کوئی سعی اور کوئی پونجی بچا رکھنے کی بات سوچی ہی نہیں جا سکتی۔ ایک فرد بھی اگر اپنی عزت اور عظمت کا تحفظ چاہتا ہے تو بسا اوقات اسے اپنی زندگی کی ساری جد و جہد وقف کر دینی پڑتی ہے۔ پھر ایک پوری ملت کی تہذیبی عزت اور دینی عظمت کا حقیقی تحفظ معمولی کوششوں سے حاصل ہو جائے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟

تیسرے مسئلہ کا حل چند ہمہ جہتی تدبیروں پر موقوف ہے اور ان تدبیروں کا موثر ہونا اقلیتی گروہوں کے اپنے عزم پر منحصر ہے۔ اگر وہ اپنی جگہ یہ طے کر لیں کہ اپنی نئی نسلوں کا دینی و تہذیبی مستقبل ہر حال میں محفوظ رکھیں گے تو یہ صورت حال یقیناً بدل جائے گی جو انکی تہذیب کو برابر چیلنج دے رہی ہے۔ اس کے لئے پہلی کوشش تو انہیں یہ کرنی ہوگی کہ ارباب حکومت پر معاملہ کی نوعیت اور اس کی سنگینی تفصیل کے ساتھ واضح کر دیں اور آپ ان کے احساس ذمہ داری کو اس بات پر آمادہ کریں کہ وہ بلا تاخیر اس نصاب تعلیم کو اکثریتی گروہ کے مخصوص عقائد اور روایات سے پاک کر دیں۔ (اگر یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکے تو ماہرین قانون کے مشورے سے عدالتی چارہ جوئی کی جائے) تیسری کوشش اور تدبیر یہ کی جائے کہ اپنے چھوٹے بڑے تعلیمی ادارے کثرت سے قائم کیے جائیں جہاں بچے اپنے دین اور اپنی تہذیب کے تقاضوں کے مطابق تعلیم بھی حاصل کر سکیں اور تربیت بھی حاصل کر سکیں۔ یہ ہر صورت میں کرنے کا اور ضروری کام ہے۔ کیونکہ سرکاری اسکولوں کا نصاب تعلیم انتہائی بہتر اور غیر جانبدار کیوں نہ بنا لیا جائے وہ کسی حال میں بھی اقلیتی گروہوں کے تہذیبی مزاج اور دینی طرز فکر سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا، اس کے نتائج ان کے حق میں ہمیشہ ناقابل اطمینان ہی رہیں گے۔

حضرات! ہندوستان کے مذہبی اور تہذیبی گروہوں کے اہم مسائل کے تعین اور ان کے حل کی تشخیص کے بارے میں میرے خیالات کا خلاصہ یہی ہے۔ قدرتی طور پر میں نے

یہ گفتگو صرف اصولی باتوں ہی کے بیان تک محدود رکھی ہے کیونکہ تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ لیکن امید ہے کہ یہ مختصر سی گفتگو بھی ضرورت کے مطابق ثابت ہوگی اور بحث کے ضروری خطوط اس سے واضح ہو گئے ہونگے

آخر میں ایک اصولی اور بنیادی حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا چاہتا ہوں کسی دینی یا تہذیبی گروہ کے مسائل کے حل کے لئے اختیار کی ہوئی تدبیریں کامیاب اس وقت ہو سکتی ہیں جب اس کے اندر ایک عام جذبہ اور ایک اجتماعی حرکت پیدا ہو چکی ہو۔ کیونکہ بلاشبہ ان مسائل میں سے ہر مسئلہ ایک بھاری چٹان ہے اور اس کے حل کی ہر کوشش گویا جوئے شیر لانا ہے۔ اسی لئے مسلسل اور منظم کوششیں ہی کامیابی سے ہمکنار ہو سکتی ہیں۔ جس تہذیبی اکائی کو اپنا دینی اور تہذیبی وجود عزیز ہوگا اس سے توقع کی جائے گی کہ وہ اس کی بقا اور حفاظت کے لئے اپنی گروہ بندیاں بھی چھوڑ دے گی اپنے اندر کی جماعتی رقابتیں بھی ختم کر دے گی۔ ورنہ جینے کی آرزو خواب ہی رہے گی۔ اور بکھرے ہوئے تنکے ان دلوں کا آشیانہ کبھی نہ بن سکیں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

بقیہ: جواں ہوں اگر میری ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۵۔ نوجوانوں اور بزرگوں کے اس اجتماع کو سماج سدھار کا ذریعہ بنایا جائے۔ تدریج ملحوظ رکھتے ہوئے ابتداء ان برائیوں سے کی جائے جو سب کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں۔ مثلاً جہیز، فلم بینی، قمار بازی، شراب نوشی وغیرہ۔

۔ کوشش کی جائے کہ مسلمان اپنے مسائل خود حل کریں۔ انکی ایک پنچایت ہو جس میں خدا ترس اور دین کا علم رکھنے والے لوگ اس میں ہوں اور ہر کمزور اور طاقتور کے ساتھ لازماً انصاف کیا جائے۔ اگر تعصب اور طرفداری حائل ہوئی تو پھر یہ پنچایت چل نہیں سکتی۔

۷۔ فروعی امور اور مسلکی اختلافات سے سختی سے دور رہا جائے ہرگز ہرگز جزئیات میں نہ الجھا جائے آپ ہی کی طرح دوسرے بھی دیندار، دین کے خادم اور اللہ و رسول سے محبت کرنے والے ہیں، اگر اس جانب سے غفلت برتی گئی تو پھر یہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے گا۔

لکھ رہا ہوں جنوں میں کیا کیا ——— ابو سفیان تقوی کے قلم سے

لکھے کو کون ٹال سکے ہے کبھی میاں

لکھنے کی ابتداء کب ہوئی؟ یہ امر قابل تحقیق ہی نہیں طالب تحقیق بھی ہے۔ پرانی دھول دانڈا اور مرد مجاہد کی خدمت میں سلام عرض ہے کہ ہماری لکھائی یا الکھت یا لکھاوٹ جیسی جانفشانیوں، انتھک کوششوں اور عرق ریزیوں کی مرہون منت ہے کہ اگر دس بل خیر سے یہ کار خیر انجام نہ دیا ہوتا تو ہم بھی لکھنے سے اسی طرح بلند رہتے جس طرح اہل سنت و جماعت کی خواتین کہ انکے یہاں صنف نازک کو پڑھایا تو خوب جاتا ہے پر لکھائی ان کے نزدیک شجر ممنوعہ سے رتی بھر بھی کم نہیں۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ ادھر دور جدید کی رنگینیوں اور روشن خیالی کی سحر انگیزیوں کی بنا پر اس شجر ممنوعہ میں اثمار مباحہ پیدا ہونے لگے ہوں کہ عصر حاضر میں کہ جب گھوڑے اور خچر کے سروں پر سینگ کا نکل آنا حتی کہ عورت کے بجائے مرد کا حاملہ ہونا بھی کوئی خاص تعجب کی بات نہیں۔

زمانے کے ساتھ ساتھ فن لکھائی نے بھی خوب خوب ترقیاں کیں۔ ایسے ایسے خطاط پیدا ہوئے کہ دنیا ان پر پتہ نہیں کب تک فخر کرتی رہے گی۔ عربی، فارسی اور اردو کے خطاط خاص طور پر قابل ذکر ہیں — دور جدید کہ جہاں خطاطوں کی جگہ حضرت کمپیوٹر لیتے جا رہے ہیں اور حضرت انسان اب پتہ نہیں کیا کریں گے غالباً وہ چاند کے بعد سورج پر خطاطی کا ارادہ کر رہے ہیں، اب بھی ایسے خطاطوں کا تعین موجود ہیں کہ گروہ لکھ دیں تو چھپائی کا گمان ہوتا ہے — یہ تو کاتبوں کی باتیں ہیں کچھ ایسے لوگ بھی تھے اب تو خال خال ہی رہ گئے کہ جنہوں نے کبھی فن لکھائی و خطاطی کی کشتی بھی نہیں کھنگھائی اور جناب کاتب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرکے ح، س، ح، اور ق سیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی اور نتیجۃً خانہ دیکھنا کار بھی نہیں پائی لیکن جب لکھنے بیٹھے تو کیا پوچھنا بڑے بڑے خطاطوں کی ناک کے بجائے کان

کاٹ گئے اور اچھے اچھے کاتبین بھی ان کے سامنے گھٹنوں کے بل چلنے لگے ـــــ پر ایسے لوگ بھاؤ بہت کھاتے ہیں۔ کاتبوں سے بھی زیادہ ـــ کبھی سابقہ پڑا کر دیکھئے!

لکھائی کے میدان میں کتابت سے کہیں زیادہ اہمیت ہینڈ رائٹنگ کی ہے۔ ـــ آپ نے بار ہا دیکھا ہوگا کہ لوگ کسی بڑے آدمی سے اس کا آٹوگراف بروزن فوٹوگراف لینے کیلئے ایک دوسرے کو کس پھرتی سے دھکا دیتے ہیں جیسے سیلاب زدگان میں سامان خورد و نوش بٹ رہا ہو ـــ مجھے وہ بات بات پر ہنسنے اور قہقہہ لگانے والا خوب رو نوجوان آج تک یاد ہے کہ آٹوگراف کے ایک زوردار دھکے میں جس کے اگلے دو دانت نصف نصف سے ایسے اڑ گئے تھے کہ دندان ساز بھی ویسا کیا تراشتا۔ اس واقعے کے بعد اس کی آٹوگرافی سرگرمیاں بند ہوئیں یا نہیں؟ مجھے نہیں معلوم ہوا اتنا ضرور معلوم ہے کہ اس نے ہنسنا اور قہقہہ لگانا بند کر دیا۔

خیر سے بات ہینڈ رائٹنگ کی چل پڑی ہے تو مجھے اپنے زمانہ طالب علمی کا ایک بھولا بسرا واقعہ یاد آ رہا ہے ـــ ہمارے زمانے میں یہ بات عام تھی، ہو سکتا ہے آج بھی ہو، کہ جو آدمی جتنا ہی بڑا ہوتا ہے اس کی رائٹنگ اتنی ہی خراب ہوتی ہے۔ ہم نے اس میزان پر اس وقت کے بڑے بڑے لوگوں کو تولا تو بات ناینٹی نائن پوائنٹ نائن نائن پرسنٹ (۹۹۰۹۹٪) سچ ثابت ہوئی اور یہ یقین بھی مستحکم ہو کر بڑا بننے کیلئے جہاں درس و تعلیم میں یکسوئی و مداومت، تحقیق و محنت و مشقت، عمیق مطالعہ اور تجال تعلیم میں حد درجہ مشق و مہارت کی ضرورت ہے وہیں رجل کبیر بننے کیلئے رائٹنگ کو حتی الامکان خراب کرنا بھی ضروری ہے ـــ اس اصول کی تائید مزید اس بات سے بھی ہوئی کہ ہم نے اپنے اساتذہ سے سن رکھا تھا کہ کاتب باوجود بڑھیا خوشنویس ہونے کے اندھا بالکل بیوقوف یا گدھا ہوتا ہے کہ "ہینی کا بیٹر" کو "اعلیٰ کا بیٹر" لکھنے میں اسے کسی قسم کی کوئی جھجک نہیں ہوتی ـــ بھلا ہوں کہ بڑا بننے کے اسی زریں اصول کو حرز جاں بناتے ہوئے میں نے اپنی رائٹنگ خراب کرنی شروع کر دی اور معاملہ یہاں تک آ پہنچا کہ ایک دن میں نے صرف کے تعلق سے گردان کے مضمون میں اس اصول کے خوب خوب جوہر دکھائے۔ گردان کے مطلوبہ مادّے لکھ کر نظر ثانی کے لئے جو دیکھا تو

پر دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا کہ بے شمار الفاظ ایسے ہیں جنہیں میں خود نہیں پڑھ پا رہا ہوں اور تھوڑی دیر کے لئے ایسا لگا جیسے میں حضرت مولانا ہو گیا ہوں ـــ درجے میں اس انداز سے داخل ہوا جیسے کوئی پروفیسر اپنے کلاس میں۔ اس قوی امید کے ساتھ کہ استاذ محترم ضرب خوب شاباشی دیں گے اور بڑی بڑی تعریفیں کریں گے ـــ مگر ہاتھ کے طوطے تو اس وقت اڑ گئے جب پہلے راؤنڈ میں وہ کاپیاں تقسیم کر دی گئیں جن کی غلطیاں معاف کر دی گئی تھیں یا جن میں غلطیوں کا احتمال ہی نہیں تھا یا جن میں غلطیاں تھیں ہی نہیں۔ ـــ ان میں اپنی کاپی نہ پا کر مارے ڈر کے کان کی لویں تک گرم ہو گئیں سرخ بھی ہوئی تھیں یا نہیں مجھے نہیں معلوم! ـــ تھوڑی امید پھر بھی بندھی تھی کہ ہو سکتا ہے مولانا کے گھر سے میری کاپی ادھر ادھر ہو گئی ہو یا راستے میں کہیں گر گئی ہو ـــ لیکن دفعتاً استاذ محترم تشریف لائے ـــ ان کے ہاتھوں میں مجرموں کے گویا نامۂ اعمال تھے ـــ آنکھیں سرخ تھیں اور مزید ستم ظریفی یہ کہ میری تمناؤں کا شاہکار یعنی کہ میری کاپی سر فہرست تھی ـــ اچانک دھک سے میرا دل حلق میں اٹک گیا ـــ کاٹو تو لہو نہیں۔ جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں ـــ اچانک مولانا دہاڑے "فلانا کہاں ہے؟" میں لرزتا کانپتا اور گرتا پڑتا اٹھا۔ انکی دعوت پر انکے قریب گیا۔ پاس پہنچتے ہی انہوں نے میرا بھرم بنانا شروع کر دیا۔ اس بحرانی صورتحال میں صرف چند جملے ہی سن سکا جیسے دور کہیں کسی صحرا سے آ رہے ہوں ـــ "نالائق کہیں کا پروفیسر بنتا ہے" "بدتمیز مذاق کرتا ہے" "اور گدھا! باپ کی دولت برباد کرنے آیا ہے" اور نہ جانے کیا کیا کہا مجھے کچھ یاد نہیں اور غالباً میں اس دن تمام مجرموں کی طرف سے اکیلے ہی کفارہ بن گیا تھا ـــ وہ دن اور آج کا دن ـــ پھر کبھی میں نے ایسی حرکت نہیں کی۔ خوب سنبھال سنبھال کر لکھتا رہا اور آج بھی یہ عمل جاری ہے لیکن پتہ نہیں کیوں پھر بھی میری رائٹنگ نہیں بنتی ـــ خیر لکھے کو مٹانا ہتھیلیوں پر سرسوں جمانے سے کم تو نہیں۔

"لکھے کو کون ٹال سکتا ہے" یہ بات اپنی جگہ کوہ ہمالہ سے کہیں زیادہ ٹھوس اور اٹل ہے ـــ اب دیکھئے ماشاءاللہ اپنی بدنی و لسانی انتھک کوششوں اور دل کی رگوں کی اتھاہ گہرائیوں سے اٹھنے والی بے مثل تمناؤں کے باوجود بھی میں مشکل صرف گریجویٹ ہو سکا

باخواب میں بارہا اپنے آپ کو وزیر اعظم کی کرسی پر جلوہ افروز دیکھنے کے باوجود پر دھاندلی کے الکشن میں بھاری اکثریت سے ناکام ہو گیا یا فن معاشیات (ECONOMICS) کی افادیت، نظریہ طلب اور نظریہ صرف جیسے ابواب کے زریں اصولوں کے ایک ایک لفظ کو حفظ بر زبان رکھنے کے باوجود بزنس کے میدان میں، مچھلی پالن، مدھ مکھی پالن، ایکوا پالن اور رو والفر پالن میں یکے بعد دیگرے اتنے عظیم خسارے اٹھانے پڑے کہ دو چار بستیوں کی مکھیوں کو بالٹیوں پر بالٹیاں بھرتے، کبوتروں کو ساون کے بادلوں کی طرح افق پر چھا کر گھنگھور گھٹا پھیلاتے اور ریشمی کیڑوں کو تعداد ہو دول میں اندر ہی اندر کلبلاتے دیکھ کر ایسا محظوظ ہو رہا تھا جیسے اب جلد ہی جارج بش ختم ہونے والا ہوں ... پر لکھے کو کون ٹال سکتا ہے؟ ذرا دیکھئے نا! کچھ رہی سہی امید جو پولٹری فارم سے وابستہ تھی پچھلے ہفتے وہ بھی خاک میں مل گئی، دہشت گردوں کے ایک ٹولے نے نہ جانے کب فارم پر دھاوا بول دیا جس کے نتیجے میں خانوادہ مرغیاں کے سارے ہی چشم و چراغ یک بیک گل ہو گئے — اس خسارۂ عظیم کے سلسلے میں پہلے تو شک بستی کے مولیان مدرسہ پر گذرا تھا مگر بعد کو رفع ہو گیا کہ فارم میں بموں کے کچھ آثار بھی ملے تھے نیز بہتیری مرغیاں مردہ پر جھوٹی زخم خوردہ ادھر ادھر پڑی تھیں — اب فن معاشیات سے بھی مجھے گھن آنے لگی ہے اور گھن کیوں نہ آئے جبکہ میں اچھا خاصا پڑھا لکھا آدمی عملی میدان میں ایک مرغی بھی نہ پال سکا اور مٹھبار جاہل کلوا تیلی لاکھوں کا بزنس بڑی دھوم سے کر رہا ہے پر کیا کریں! صبر کرنا ہی پڑتا ہے، لکھے کو کون ٹال سکتا ہے؟

مجھے کلوا تیلی پر بہت رشک آتا ہے اور کبھی کبھی یہ خیال بھی ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ اے کاش! میں بھی انپڑھ ہوتا تو کم از کم ایک عدد کار کا تو مالک ہوتا کیونکہ پڑھے لکھے لوگ جھکی، مکار، اور سقراط و بقراط ہونے کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی پاگل بھی ہو جاتے ہیں ... مجھے وہ ایل ایل بی نوجوان کبھی نہیں بھولے گا جو زیادہ لکھنے اور پڑھنے کی بنا پر گورنر سپالک سے سالوانی سڑک کی پر مضمون نگاری کیا کرتا تھا — اس نوجوان کو

دیکھ کر میرے ذہن میں بے ساختہ یہ شعر چٹکیاں بھرنے لگتا ہے

لکھنا پڑھنا کام بُرا ہے　　لکھنے کا انجام بُرا ہے۔

میرے ایک بڑے بچہ فریکی دوست جو تقدیر کی اٹل حقیقت کی بابت کچھ ڈھلمل یقین تھے اور اس سلسلے میں خواہ مخواہ شک گذرا کرتے تھے اور بسا اوقات اچھا پائی بھی کر ڈالتے تھے ابھی چند روز قبل میرے کمرے میں ہانپتے ہوئے تشریف لائے غالباً انہوں نے شیروانی میں ہونے کے باوجود راستے بھر بڑی طرح دوڑ لگائی تھی، آتے ہی یوں گویا ہوئے — "یار تمہاری بات ایک سو ایک فیصد درست ہے مطلب ہے کہ لکھے کو کون ٹال سکتا ہے" میں نے کہا "کیا اس بار پھر تمہاری بھینس نے پڑوا ہی جنم دیا ہے" انہوں نے ناگواری سے کہا "نہیں ... یار کیا تمہیں معلوم نہیں کہ حفاظتی انتظامات کے ہوتے ہوئے ہندوستانی حکومت کی مرضی کے علی الرغم اور سب سے بڑی بات یہ کہ مسلمانان عالم کی دلی دعاؤں کے باوجود بابری مسجد گر گئی" میں نے کہا "میاں! تم آج قائل ہوئے ہو پر مجھے اس کی شہادت کا یقین اسی وقت ہو گیا تھا جب ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمانان ہند نے سرخ سرخ فیروز آبادی چوڑیاں پہنے برادران وطن کو للچائی للچائی نظروں سے دیکھنا شروع کر دیا تھا" وہ آنکھیں پھٹر پھٹرا کر بھکارے "میں نہیں سمجھا" — میں نے کہا "اللہ مزید کی توفیق دے۔ کیا تم افغانی، فلسطینی، بوسنیائی اور کشمیری مسلمانوں کو نہیں دیکھتے" — انہوں نے کہا "کیوں نہیں! پر یہ تو ہندوستان ہے یہاں کے حالات الگ ہیں — لیکن افسوس ...... بابری مسجد کی شہادت — پر کیا کریں یہی لکھا تھا" میں نے کہا "گھبراؤ مت پیارے اگر مسلمانوں نے ایسی ہی جوانمردی کا ثبوت دیا تو تمہاری لاش کا قیمہ بھی کتوں کے حق میں لکھا جائے گا" — میرے اس جواب پر وہ اچانک اتنی تیز گرم ہو گئے کہ ہونٹوں کی پھڑ پھڑاہٹ میں انکی زبان گنگ ہو گئی اور اعصابی تناؤ اتنا زیادہ بڑھا کر دیا ایک ہی جھپ میں خارج از قمرہ ہو گئے — افسوس! میں ان کا رد عمل بھی نہ سن سکا —

کہانی کے موضوع پر بہت سی باتیں رقم کرنی ابھی باقی تھیں پر چلنے کی منگ وا کر کیا کیجئے، لیکن افسوس! اختصار جنوں کے چکر میں اظہار تمنا کر نہ سکا — ویسے نہ چاہتے ہوئے بھی اگلے کام تک کیلئے اللہ حافظ —

خالدہ تسنیم فلاحی سیوان

جواں ہوں اگر میری قوم کے جسور و غیور

دشمنوں کی سرزمین، بھاگلپور کو دنیا اس طور سے جانتی ہے کہ وہاں چار سال قبل[1] ہندوستان کا بھیانک ترین فساد کرایا گیا تھا۔ ظلم و بربریت کی دیوی ننگا ناچی تھی۔ جو حسن پرستوں نے اسکے حسن کو لوٹا اور مسکراہٹوں کو چھینا تھا۔ ظالموں نے اس کے بال و پر نوچنے، اسے اجاڑنے اور تباہ و تاراج کرنے کی ہر تدبیر کر ڈالی تھی۔ اس فساد کی سنگینی کا عالم یہ تھا کہ کہنے والے یہ کہہ اٹھے کہ ابو اللیث صاحب، علی میاں اور فلاں اور فلاں خاموش ہیں، انہیں اب کس چیز کا انتظار ہے؟ یہ لوگ کچھ "اعلان کیوں نہیں کرتے؟ کیا یہ اس وقت زبان کھولیں گے جب فاتحہ پڑھنے والا بھی کوئی نہ ہوگا؟"

پر وہ وقت تھا کہ ایک بار پھر ہم نے سنجیدگی سے جائزہ لیا تھا کہ ہندوستان سے ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے اور ہم واقعی کس پوزیشن اور کس مقام پر کھڑے ہیں اور ہمارا یہ طے شدہ فیصلہ برقرار تھا کہ ہماری خاک اس سرزمین سے وابستہ ہے اور اسی سے وابستہ رہے گی۔ ہمیں یہیں جینا اور مرنا ہے البتہ دوسروں کے سامنے کاسۂ گدائی پھیلانے اور حقوق کی بھیک مانگنے کے بجائے ہمیں اپنے دست و بازو پر بھروسہ کرنا ہے۔ خود اپنی راہ نکالنی، اپنے مسائل خود حل کرنے اور اپنی حفاظت آپ کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے رسولؐ کا قرآن ہمارے سامنے تھا اور ہمیں یقین تھا کہ باہر کا کوئی دشمن ہمارے لئے اتنا مہلک نہیں ہو سکتا جتنا کہ خود ہماری ذات اور ہمارا عمل ہماری ہلاکت کا سبب بن سکتا ہے۔ کیا عجب اس طرح آسمان سے بجلیاں گرنے کا سبب ہم خود ہوں۔ اس لئے اولین فکر ہمیں اپنی ذات کی ہونی چاہئے۔ ارشاد رسولؐ ہے۔

عن ثوبان قال قال رسول اللہ ﷺ انی سألت ربی لامتی ان لا یھلکھا بسنۃ عامۃ وان لا یسلط علیھم عدوا من سوی انفسھم فیستبیح بیضتھم وان ربی قال یا محمد انی اذا قضیت قضاء فانہ لا یرد وانی اعطیتک لامتک ان لا اھلکھم بسنۃ عامۃ وان لا اسلط علیھم عدوا من سوی انفسھم یستبیح بیضتھم واجتمع علیھم من باقطارھا او قال من بین اقطارھا حتی یکون بعضھم یھلک بعضا ویسبی بعضھم بعضا (مسلم ۲۲۱۵، باب ھلاک ھذہ الامۃ بعضھم ببعض)	حضرت ثوبان سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے اپنی امت کے لئے درخواست کی وہ عام قحط سالی سے میری امت کو تباہ نہ کرے، اور کسی باہر کا کوئی دشمن مسلط نہ کرے کہ وہ اسکی حرمتوں کو پامال کرے۔ میرے رب نے جواب میں فرمایا اے محمد میں فیصلہ کرتا ہوں تو ٹالا نہیں جا سکتا۔ تمہاری امت کیلئے میرا تم سے یہ عہد ہے کہ میں انہیں کسی عام قحط سالی سے ہلاک نہیں کروں گا اور نہ ان پر باہر کا کوئی دشمن مسلط کروں گا جو انکی حرمتوں سے کھیلے گرچہ روئے زمین کے تمام لوگ انکے خلاف اکٹھا کریں، یہاں تک کہ یہ لوگ باہم خود ایک دوسرے کو ہلاک کریں گے اور ایک دوسرے کو قیدی بنائیں گے۔

[1] ۵ ماہ قبل اس مضمون کی کتابت ہو گئی تھی طباعت میں تاخیر ہوتی گئی

یہ اللہ کا ہم سے وعدہ ہے کہ کوئی ایسا دشمن مسلط نہیں کرے گا جو ہمیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے اگر داخلی محاذ درست ہے تو بیرونی دشمن کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ خطرہ تو اس وقت بڑھتا ہے جب داخلی محاذ کمزور ہو جائے۔ اس لئے ہمیں سب سے زیادہ توجہ اسی محاذ پر دینی چاہئے اور چوکنا رہنا چاہئے کہ کہیں ہم خود اپنی ہلاکت کا سبب نہ بن جائیں۔ پوری اسلامی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ جتنی بھی مصیبتیں ہم پر آئیں اور جتنے بھی قہر ہم پر ٹوٹے ان میں بنیادی رول خود ہمارا رہا ہے۔ بغداد پر تاتاریوں کی یلغار اسلامی تاریخ کا سیاہ ترین اور بھیانک باب ہے۔ ہلاکو خاں قہر الٰہی بن کر ٹوٹا تھا۔ اس نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور سرزمین بغداد ہمارے خون سے لالہ زار ہو گئی لیکن اس پر بھی تو غور کیجئے کہ ہلاکو خاں کو حملہ کی دعوت دینے اور سازشوں کے جال بن کر ہماری جڑیں کھودنے اور ہمیں کھوکھلا کر دینے والا معتصم باللہ کا وزیر اعظم ابن العلقمی ہم ہی میں کا ایک فرد تھا۔ یہ میر جعفر اور میر صادق

کون تھے اور کیا یہ کریم چا گلہ، عبدالحمید دیوانی ہماری صفوں سے تعلق نہیں رکھتے؟

بھاگلپور ہی کو لے لیجئے۔ فساد سے قبل ہی سے عام طور پر مسلمان مسلم غنڈہ گردی سے نالاں اور پریشان تھے۔ نہ کسی کی جان محفوظ تھی، نہ کسی کا مال سلامت تھا۔ کہتے ہیں فساد سے قبل تقریباً دو سو بہترین مسلم نوجوان جو ہماری قوت اور ہمارا ہی دست و بازو تھے، مسلم غنڈہ گردی کا شکار بن کر موت کی نیند سو چکے تھے۔ فساد کے زمانہ میں یہ باہمی خونریزی ذرا تھمی رہی، لیکن چند ماہ بعد اس نے پھر سر اٹھایا۔ بتایا جاتا ہے کہ دو تین ماہ قبل تک مزید دو سو مسلم نوجوانوں کو مسلم غنڈہ گردی نے نگل لیا۔ صورت حال یہ تھی کہ کب کسے بھرے بازار سے اٹھا لیا جائے، نہیں معلوم۔ شریف شہری چوڑیاں پہنے بیٹھے رہ جاتے۔ خوف و دہشت کا عالم یہ تھا کہ لوگوں سے رقم کا مطالبہ کیا جاتا، لوگ خاموشی سے رقم فراہم کر دیتے۔ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے کوئی تشدد کا نشانہ بنتا اور اسے پہلے نگاہوں سے پھر دنیا ہی سے غائب کر دیا جاتا۔ لوگوں کو سب کچھ خبر ہوتی، لوگ نگاہیں بھی کر کے دیکھتے لیکن اکا دکا مثالوں کے سوا کسی کی رگ حمیت نہ پھڑکتی، کوئی ہاتھ مظلوموں کی حمایت کیلئے نہ اٹھتا۔ تبصرہ بھی ہوتے تو خاموشی سے پہلے ادھر ادھر دیکھ لیتے کہ کہیں کوئی دیکھ یا سن تو نہیں رہا ہے پھر کانا پھوسی کرتے۔

یہ بھاگلپور کی ایک تصویر تھی ظلم و بربریت کی تصویر، بزدلی اور بے غیرتی کی تصویر۔ اب دوسری تصویر یہ ہے کہ غنڈہ دم دبا بیٹھا ہے، کئی نوجوانوں نے تقریباً شہر چھوڑ دیا ہے، جو ہیں بے دست و پا اور بھیگی بلی نظر آتے ہیں۔ انکے بم اور بارود بیکار ہو گئے، ریوالور اور پستول بھی دبانے پر بھی فائر نہیں ہوتے۔ شریف شہریوں نے اپنی چوڑیاں اتار دی ہیں، انکی سب سے بڑی خرابی انکا انتشار دور ہو چکا ہے۔ اب وہ مجتمع ہیں اور ان کا اتحاد انکی طاقت ہے۔ وہ ہر غنڈہ گردی اور لوٹ مار کے خلاف ایک مضبوط آواز ہیں۔ راتوں میں انکی پہرے کی باریاں ہیں، ہر بوڑھا اور نوجوان اس میں شریک ہوتا ہے۔ رات کے کسی بھی حصہ میں اگر کوئی ان کے علاقہ سے گزرنا چاہے تو اس کا گہرا جائزہ لیا جاتا ہے۔ تقریباً تمام مسلم محلوں کا یہی حال ہے۔ پہلے یہ منتشر تھے، کمزور تھے، اب مجتمع ہیں، ایک طاقت ہیں۔ اور تخریب کاری ہمارے ملک ہی کا نہیں، پوری دنیا کا مسئلہ ہے، لوگ غنڈوں سے ڈرتے ہیں، ڈاکوؤں سے

پناہ مانگتے ہیں، حکومت بھی ہاتھ ڈالنے سے ہچکچاتی ہے حالانکہ اکثریت ان کی نہیں، امن پسندوں کی ہوتی ہے، پھر بھی یہ تو تھوڑے ہوتے ہیں جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ انکی ایک ٹولی ہوتی اور جتھا ہوتا ہے۔ جس میں نظم و ضبط رہتا ہے اور منصوبہ بندی ہوتی ہے ہمارا معاشرہ آج بھی شریفوں سے خالی نہیں ہوا ہے۔ شرفاء کی کمزوری یہ ہے کہ وہ بکھرے ہوئے ہوتے ہیں، جنکے درمیان باہم کوئی ربط نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے چند افراد کی ٹولی بھی ان پر حاوی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اگر انکے اندر اجتماعیت پیدا ہو جائے تو پھر ڈاکو ٹھہر نہیں سکتے غنڈوں کو بھاگنا پڑتا ہے۔ بھاگلپور کی عملی مثال ہمارے سامنے ہے۔ دوسری جگہوں کے شرفاء کو بھی جرأت سے کام لینا چاہئے اور اپنی چوڑیاں اتار دینی چاہئے، یہ شرافت نہیں ہے کہ انسانیت سر بازار رسوا ہو اور آپ حرکت میں نہ آئیں۔ آپکی نگاہوں کے سامنے کسی کو ذبح کیا جائے اور آپ صرف کلبلا کر رہ جائیں۔

کسی کی عزت لٹ جائے اور آپ کو غیرت نہ آئے۔ یہ بزدلی اور بے غیرتی ہی نہیں انسانیت سے گری ہوئی حرکت اور ناقابل معافی جرم ہے۔ آپکی خاموشی ظالموں کے ساتھ خاموش تعاون ہے۔ انسانیت اور شرافت تو یہ ہے کہ آپ کے اندر مردانگی ہو، بیکس نگاہوں کو نکالنے، بے لگام زبان کو کھینچنے اور ظالم کی کلائی موڑنے کا دم داعیہ ہو۔ شرافت کمزوری اور بزدلی کو نہیں کہتے، بے ضمیری اور بے غیرتی کا نام شرافت نہیں۔ شرافت تو یہ ہے کہ برائیوں کے خلاف آپکی آنکھوں میں خون اتر آئے اور آپ اپنے بس بھر کر گزریں۔ اس کے لئے خیر پسند لوگوں کو جمع کرنا ہوگا، انکی ٹولی بنانی ہوگی اور انہیں مادی اور معنوی دونوں پہلوؤں سے مضبوط کرنا ہوگا۔ یہی دینداری کا تقاضا اور نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ ہے اور اسی میں آپ کی بقا ہے۔ مکہ کے شریف لوگوں نے باہم ایک معاہدہ کیا تھا جسکی رو سے یہ طے تھا کہ انہیں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کریگا اور مکہ میں کوئی ظالم رہنے نہیں پائے گا۔ نبیؐ اس معاہدہ میں شریک تھے۔ بعد میں فرمایا کرتے کہ میں آج بھی اس معاہدہ پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔

اگر آپ نے اس اسوۂ حسنہ کی پیروی نہ کی تو پھر یاد رکھئے آج کسی کی باری ہے، کل آپکا نمبر ہوگا۔ ظلم کے نشانہ پر آج کوئی ہے، کل آپ کے بچے ہوں گے۔ آج آپکا پڑوسی لٹا ہے،

کل آپ کے گھر سے دھواں اٹھے گا۔

قابل مبارکباد اور صد آفرین ہیں وہ حوصلہ مند نوجوان اور بزرگ جنہوں نے اس صورتحال کو بدلنے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور آج ظلم کے خلاف صف آرا ہیں۔ اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کچھ مشورے دیئے جائیں۔

۱۔ ان اسباب کا پتہ لگایا جائے جنہوں نے نوجوانوں کو غنڈہ گردی کی طرف دھکیلا ہے اور انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

۲۔ محنت اور جفاکشی پر ابھارا جائے اور کوشش کی جائے کہ وہ کسی کام پر لگ سکیں، بیکار نہ رہیں۔ بیکاری غلط راہیں سجھاتی ہے۔

۳۔ ان مفاد پرست سیاستدانوں اور نیتاؤں سے ہوشیار رہا جائے جو اپنا الو سیدھا کرنے کیلئے نوجوانوں کو بانٹ ڈالتے ہیں۔ آئندہ الیکشن کے موقع پر اس کے زیادہ اندیشے ہیں۔

۴۔ نوجوان ظلم کے خلاف اس وقت اٹھا ہے اسے غنیمت سمجھا جائے اور اس کو بنیاد بنا کر بالتدریج، حکمت کے ساتھ انکی اصلاح کی کوشش کی جائے اور انہیں معنوی اور مادی دونوں پہلوؤں سے مسلح کیا جائے معنوی اعتبار سے مراد یہ ہے کہ انہیں اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا جائے، وہ امانت دار اور خداترس ہوں، ان سے خیر کی توقع کی جا سکے، انکی دوستی اور دشمنی اور جینا اور مرنا اللہ کیلئے ہو۔

مادی اعتبار سے مراد یہ ہے کہ وہ مضبوط اور توانا ہوں اور انہیں ہر ممکنہ جائز ذریعے سے مضبوط کیا جائے۔ اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ ۔ طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر ہوتا ہے۔ قرآن کا یہ فرمان بھی ہمارے سامنے رہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (انفال ۶)

اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے انکے مقابلہ کیلئے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے اللہ کے اور اپنے دشمنوں پر تمہاری ہیبت رہے اور دوسرے اعداء پر بھی جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ جانتا ہے۔

بقیہ صـ ۲۲ پر

قوم عاد کے آثار دریافت کر لئے گئے

۵ ہزار سال قبل مسیح کی تہذیب قرآنی بیان کے عین مطابق پائی گئی

ل اس میگزین ٹائم کی رپورٹ آپ نے پڑھ لی۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ قوم عاد کے آثار کی اس اہم نئی دریافت سے قرآن میں بیان کردہ کن کن حقائق کی توثیق ہوتی ہے۔ قوم عاد کا تذکرہ قرآن کی اٹھارہ سورتوں میں آیا ہے اور لفظ عاد ۲۴ مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ اٹھارہ میں سے نو سورتوں میں یہ تذکرہ ضمناً ہے اور نو میں تفصیلاً۔ ظاہر ہے کہ اس مختصر سی تحریر میں ان ساری معلومات کا احاطہ ممکن نہیں اس لئے اشاروں ہی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔

اس حوالے سے سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ قوم عاد کے یہ آثار ٹھیک اسی علاقے میں دریافت ہوئے ہیں، جسے قرآن نے اس قوم کا علاقہ قرار دیا ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"ذرا انہیں عاد کے بھائی (مراد اس قوم کی جانب بھیجے گئے رسول حضرت ہود علیہ السلام ہیں) کا قصہ سناؤ جب کہ اس نے احقاف میں اپنی قوم کو خبردار کیا تھا" (۴۶ : ۲۰)

مولانا مودودی نے قرآن میں بیان کردہ اس مقام احقاف کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"احقاف" حقف کی جمع ہے جس کے معنی ہیں ریت کے لمبے لمبے ٹیلے جو بلندی میں پہاڑوں کی حد کو نہ پہنچے ہوں، لیکن اصطلاحاً یہ صحرائے عرب (الربع الخالی) کے جنوب مغربی حصے کا نام ہے جہاں آج کوئی آبادی نہیں ...... الاحقاف کی موجودہ حالات دیکھ کر کوئی شخص یہ گمان بھی نہیں کر سکتا کہ کبھی یہاں ایک شاندار تمدن رکھنے والی قوم آباد رہی ہوگی" (تفہیم القرآن جلد چہارم: ۶۱۳-۶۱۵)

عاد کے آثار کی اس ابتدائی دریافت سے جو سب سے نمایاں بات معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ اس قوم کو بلند و بالا عمارتیں، محل اور قلعے بنانے کا غیر معمولی شوق تھا۔ قرآن میں جنون کی حد تک پہنچے ہوئے ان کے اس شوق کا نقشہ ان کی جانب بھیجے گئے نبی حضرت ہود علیہ السلام کی زبان

ل پہلی قسط نومبر سنہ ۹۱ء کے شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

سے ادا ہونے والے الفاظ کو ملحوظ رکھ کر یوں لکھا گیا ہے:

"یہ تمہارا کیا حال ہے کہ ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو گویا تمہیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔" (۲۶ : ۳۰)

خود لاس اینجلس کے ماہرین آثار قدیمہ کے ہاتھوں "ارم" نامی جو شہر دریافت کیا گیا ہے اس کی عمارت کی نمایاں خصوصیت اونچے اونچے مینار ہیں خاص اس شہر کا ذکر قرآن کی سورہ فجر میں ان الفاظ میں موجود ہے:

"الم تر کیف فعل ربک بعاد ۝ ارم ذات العماد ۝ التی لم یخلق مثلها فی البلاد ۝"

یعنی: "کیا تم نے نہیں دیکھا کہ کیا تمہارے رب نے عاد (اور) اونچے اونچے ستونوں والے (شہر) ارم کے ساتھ جیسا کوئی (شہر) ملکوں میں نہیں بنایا گیا۔" (۸۹ : ۶–۸)

آج شہر ارم کے جو آثار دریافت ہوئے ہیں وہ ٹھیک ان آیات قرآنی کے مطابق ہیں۔ لاس اینجلس ٹائمز کی جو رپورٹ آپ نے پڑھی اس میں اس شہر کی مرکزی عمارت کے ستونوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔ اس حوالے سے قرآن کی جو آیات اوپر درج کی گئیں اگرچہ ان میں لفظ "ارم" سے شہر ہی مراد لینا قابل ترجیح نظر آتا ہے لیکن بہت سے مفسرین نے لفظ "ارم" سے شہر کے بجائے قوم عاد کے اجداد میں سے ایک شخص مراد لیا ہے جس کے بعد "ارم" کی صفت "ذات العماد" یعنی اونچے اونچے میناروں والا" کی تاویل یہ کی گئی ہے کہ قوم عاد جو حضرت نوحؑ کے پوتے ارم بن سام کی اولاد تھی در اصل بڑی قد آور اور قوی الجثہ قوم تھی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اسے اونچے اونچے میناروں سے نسبت دی ہے چنانچہ بعض تفاسیر میں یہ ناقابل یقین روایات بھی ملتی ہیں کہ قوم عاد کے لوگ بارہ بارہ گز اور بعض حکایات کے مطابق ساٹھ ساٹھ گز لمبے ہوتے تھے (بحوالہ علامہ شوکانی) اس تاویل کے نتیجے میں بعد کی آیت "التی لم یخلق مثلها فی البلاد" کا مفہوم یہ لینے کے بجائے کہ "شہر ارم جیسا کوئی شہر دنیا کے ملکوں میں تعمیر نہیں کیا گیا تھا" یہ لیا جانے لگا کہ "عاد ارم جیسی کوئی قوم دنیا میں پیدا نہیں کی گئی تھی"۔

مولانا مودودیؒ نے اس آیات کا جو ترجمہ کیا ہے وہ یہ ہے:

"تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارے رب نے کیا برتاؤ کیا اونچے ستونوں والے عاد ارم کے ساتھ جن کی مانند کوئی قوم دنیا کے ملکوں میں پیدا نہیں کی گئی تھی۔" (تفہیم القرآن۔ جلد ششم سورہ فجر)

مولانا امین احسن اصلاحی نے ان آیات کا ترجمہ یوں کیا ہے:

"دیکھا نہیں کیا کیا تیرے خداوند نے عاد کے ساتھ ...... ستونوں والے ارم کے ساتھ ...... جن کا ثانی نہیں ہوا ملکوں میں" (تدبر قرآن۔ جلد ۹۔ سورہ فجر)

ان دونوں ترجموں اور ان کی تفسیر میں "ستونوں" کو "شہر ارم" کی نہیں بلکہ "قوم عاد ارم" کی صفت قرار دیا گیا ہے۔ تاہم اس صفت کا سبب ان کی قد و قامت کو نہیں بلکہ ان کے طرز تعمیر کو بنایا گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ مشکل اپنی جگہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے ارم کو شہر نہیں بلکہ فرد یا قوم سمجھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ درست کیا ہے؟ یہ جاننے کیلئے جب ہم اپنے تفسیری سرمایہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے متعدد نہایت معتبر و جدید علماء نے لفظ ارم سے شہر یا عمارت ہی مراد لیا ہے۔ چنانچہ شاہ عبد القادرؒ کے ترجمہ قرآن میں جسے بعد میں شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے بامحاورہ اردو کے قالب میں ڈھالا اور جسے مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے اپنی تفسیر معارف القرآن میں اختیار کیا ہے ان آیات کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

"تو نے نہ دیکھا کیسا کیا تیرے رب نے عاد کے ساتھ ... وہ جو ارم میں تھے بڑے ستونوں والے کہ بنی نہیں ویسی سارے شہروں میں۔" (معارف القرآن۔ سورہ فجر ۶–۸)

اسی طرح انگریزی زبان میں قرآن کے نہایت قابل اعتماد مترجم محمد مارماڈیوک پکتھال نے "ارم ذات العماد" کا ترجمہ "Many coloumnde Iram" کرکے اور پھر Coloumn کی تشریح Pillar سے کرکے واضح کر دیا ہے کہ ارم سے کوئی قوم نہیں بلکہ مقام یا عمارت مراد ہے۔

علامہ یوسف علی نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن میں "ارم ذات العماد" کا ترجمہ یوں کیا:

"The (city) of Iram with lofty Pillars"

اور اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ:

"معلوم ہوتا ہے کہ ارم جنوبی عرب میں عاد اولیٰ کا دار الحکومت تھا۔"

علامہ یوسف علی نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ بعض مفسرین ارم کو قوم عاد کا ایسا ہیرو

سمجھتے ہیں جس کے نام پر اس قوم کا نام رکھا گیا لیکن خود انھوں نے لفظ ارم کا یہ مفہوم اختیار نہیں کیا بلکہ واضح طور پر اسے شہر یا ملک عاد کا دارالحکومت قرار دیا ہے۔

علامہ قرطبی کے حوالے سے مولانا مفتی محمد شفیعؒ لکھتے ہیں کہ:

"بعض مفسرین نے فرمایا کہ ارم اس جنت کا نام ہے جو عاد کے بیٹے شداد نے بنائی تھی اور اسی کی صفت ذات العماد ہے کہ وہ ایک عظیم الشان عمارت بہت سے ستونوں پر قائم سونے چاندی اور جواہرات سے بنائی گئی تھی تاکہ لوگ آخرت کی جنت کے بدلے اس نقد جنت کو اختیار کر لیں مگر جب یہ عالیشان محلات تیار ہو گئے اور شداد نے اپنے درباریوں کے ساتھ اس میں جانے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوا اور یہ سب ہلاک ہو گئے اور محلات بھی مسمار ہو گئے"۔ (معارف القرآن۔ جلد ۸ صفحہ ۷۴۱)

ان حوالوں سے واضح ہے کہ قرآن میں لفظ ارم، قوم عاد کے مرکزی شہر یعنی کیلئے آیا ہے اور اونچے اونچے ستون اور مینار اسی شہر کی صفت بیان کئے گئے ہیں۔ اس طرح ماہرین نے شہر ارم کے جو آثار دریافت کئے ہیں وہ ٹھیک قرآن کے بیان کے مطابق ہیں لیکن عاد کے آثار کے بالکل معدوم ہو جانے کی بنا پر ماضی میں اس لفظ کی درست طور پر تحقیق نہ ہو سکی جس کی بنا پر بعض مفسرین "ارم ذات العماد" سے شہر کے بجائے قوم مراد لینے لگے جس کا نام ایک قومی ہیرو یعنی حضرت نوحؑ کے پوتے ارم بن سام کے نام پر رکھا گیا تھا جبکہ شہر کا نام ارم ہونے کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے کا نام نہیں تھا عین ممکن ہے کہ قوم عاد نے اپنے مرکزی شہر کا نام اپنے اس قومی ہیرو ہی کے نام پر رکھا ہو۔

ماہرین آثار قدیمہ کی اس ابتدائی دریافت سے یہ پتہ بھی چلتا ہے کہ قوم عاد اپنے وقت کی ایک انتہائی خوشحال اور طاقتور قوم تھی۔ اس کا ایک ثبوت تو اس کا ذوق عمارت سازی ہی ہے جس پر ہم قرآن کی روشنی میں تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی اس قوم کی خوشحالی کی بڑی بھرپور منظر کشی قرآن میں کئی مقامات پر کی گئی ہے۔ مثلاً سورہ اعراف کی آیات ۶۵ تا ۷۲ میں بتایا گیا ہے کہ عاد کو اللہ نے قوم نوحؑ کا جانشین بنایا تھا اور انھیں مادی اور جسمانی طور پر کشادگی و برتری دی تھی۔ اسی طرح سورہ شعراء کی آیات ۱۲۳ تا ۱۴۰ میں ہے کہ اللہ نے اس

قوم کو اولاد، باغوں، چشموں اور مال مویشی کی کثرت کے ذریعے خوشحالی عطا کی تھی۔ ماہرین آثار قدیمہ کی تازہ دریافتوں سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ یہ علاقہ جو آج لق و دق ریگستان ہے کبھی یہاں دریا بہتے تھے اور پانی کی فراوانی تھی لیکن پھر یہ سب نابود ہو گیا۔

اب رہ گئی یہ بات کہ قرآن کے مطابق اس قوم پر جو عذاب نازل ہوا وہ کیا تھا اور کیا اس قوم کے آثار کی حالیہ دریافت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ قوم اسی نوعیت کے عذاب کا شکار ہی جس کا ذکر قرآن میں ہے؟ اس نقطہ نظر سے قرآن کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ جدید دریافت حیرت انگیز طور پر قرآنی حقائق کے مطابق ہے۔ قوم عاد پر آنے والے عذاب کا ذکر قرآن میں کئی مقامات پر ہے اور ہر جگہ اسے ایک بے پناہ آندھی بتایا گیا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ واضح تذکرہ سورۃ الحاقۃ میں یوں ملتا ہے:

"اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جڑ کاٹ دینے کے لئے اس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا۔ تم وہاں ہوتے تو دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں جیسے کھجور کے بوسیدہ (ایک اور قرآنی بیان کے مطابق کھوکھلے) تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے"۔ (۶۹: ۶-۸)

قرآن کے اس بیان کا جیتا جاگتا ثبوت جنوبی عرب کا وہ بے آب و گیاہ صحرا ہے جہاں آج امریکی ماہرین ہزاروں برس پرانے آثار کی تلاش میں مصروف ہیں۔ سات رات اور آٹھ دن تک چلنے والی طوفانی آندھی نے اللہ کے حکم سے اپنے وقت کی اس سب سے زیادہ ترقی یافتہ، خوشحال اور طاقتور قوم پر جسے اس دور کی سپر پاور کہنا بالکل درست ہوگا لاکھوں ٹن ریت اس طرح الٹ دی کہ یہ پوری تہذیب اپنے شکر سر کش باسیوں اور بلند و بالا عمارات سمیت ریت کے تودوں کے نیچے دفن ہو گئی اور آج ہزاروں برس بعد ماہرین آثار قدیمہ دو سو ٹن ریت ہٹا کر اس تہذیب کے ایک بہت چھوٹے سے حصے کو دریافت کر پائے ہیں۔

قرآنی حقائق کے ان پہلوؤں پر گفتگو کے بعد ایک آخری اور نہایت حیرت انگیز بات قرآن کا یہ بیان ہے کہ عاد کی کامل تباہی کے باوجود اللہ نے ان کی عمارتوں کے آثار کو باقی رکھا ہے۔ سورۃ احقاف میں ان پر نازل ہونے والے عذاب کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے:

اخبار علمیہ

ابن العلم فلاحی کے قلم سے

اقتصادیات پر قرآنی موسوعہ

قاہرہ کے معہد فکر اسلامی نے قرآنی آیات کی روشنی میں ایک ایسا موسوعہ تیار کیا ہے جس کی روشنی میں اقتصادیات پر کام کرنے والے افراد اسلامی نقطہ نظر آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، اسکے مرتب محی الدین عطیہ ہیں اسکی تیاری میں تین سال کا عرصہ لگا ہے۔ اور یہ پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ (ماہنامہ الاسلام دہلی جنوری ۱۹۹۳ء ج ۲ ش ۱ ص ۵۲)

عربی تعلیم بذریعہ ٹیلی ویژن

اسلامی نشریاتی کمپنی نے عربی زبان کی تعلیم کو عام کرنے کیلئے اے ٹی وی پروگرام پیش کرنے کیلئے مکمل پروگرام تیار کر لیا ہے، اسکا نظام الاوقات تیار کیا جا چکا ہے۔ اس اہم اسلامی پروگرام کیلئے شاہ فہد بن عبدالعزیز نے ۸ لاکھ ڈالر کا عطیہ پیش کیا ہے۔

(ماہنامہ الاسلام دہلی جنوری ۱۹۹۳ء ج ۲ ش ۱ ص ۲)

شاہ سعود یونیورسٹی میں اردو کورس شروع ہوگا

شاہ سعود یونیورسٹی کا ادارہ برائے لسانیات و ترجمہ بہت جلد اردو کورس شروع کریگا۔ وامی (WAMY) کے اسسٹنٹ سکریٹری اور شاہ سعود یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر ابراہیم القائد نے کہا کہ وہ کافی عرصہ سے یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم شروع کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

(سہ روزہ دعوت نئی دہلی ۲۵ ر ش ۱۹ ار دسمبر ۱۹۹۲ء)

یونیورسٹیوں میں طلبہ کو یہودی سازشوں سے باخبر رکھنے کی تجویز

رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف نے دنیا کے آٹھ سربراہان جامعات کو خط لکھکر ۱۲۹۵ھ میں مکہ مکرمہ میں مساجد کونسل کے زیر اہتمام "پیغام مسجد" نامی کانفرنس کی اسی قرارداد کی طرف متوجہ کیا ہے جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ عالم اسلام کی جامعات کو چاہئے کہ وہ اپنے ہر کورس کے مرحلہ میں ایک گھنٹہ یا اس سے زائد مخصوص کر دیں تاکہ قدس اور مسجد اقصیٰ کے خلاف ہونے والی یہودی سازشوں سے طلبہ کو آگاہ کیا جا سکے اور ذہنی طور پر انکے مقابلے کیلئے انہیں تیار کیا جا سکے اسی خط میں انہوں نے ان اداروں کے ناظمین سے یہ بھی گذارش کی ہے کہ اس غرض و غایت کو عملی جامہ پہنانے کیساتھ ساتھ وہ اس سلسلہ میں کی جانے والی کوششوں سے بھی انہیں مطلع کریں۔ ان یونیورسٹیوں کا تعلق مسلم ملکوں سے ہے۔ (سہ روزہ دعوت نئی دہلی، ۲۰ دسمبر ۱۹۹۲ء)

محمد اسمٰعیل فلاحی

جامعہ کے لیل و نہار

نظامت میں تبدیلی

انتظامیہ کا اجلاس ۲۳ اور ۲۴ جنوری ۱۹۹۳ء کو جامعہ میں ہوا اس دفعہ نظامت کے لئے انتظامیہ کی نظر انتخاب جناب حاجی عبدالمتین صاحب پر پڑی موصوف بلریاگنج کے رہنے والے اور انتظامیہ کے تاسیسی ممبر ہیں، مختلف مواقع پر انہوں نے نائب ناظم، اور معتمد مال کی حیثیت سے جامعہ کی خدمات انجام دی ہیں۔

مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نائب ناظم مقرر کئے گئے ہیں، موصوف بھی انتظامیہ کے تاسیسی ممبر ہیں، آپ ناظم جامعہ اور متعدد بار صدر جامعہ رہ چکے ہیں۔

الوداعی نشست

جامعۃ الفلاح ہر سال فراغت کی دہلیز پر کھڑے اپنے جگر پاروں کو میدان کارزار میں قدم رکھنے سے پہلے الوداعیہ دیتا ہے۔ اس موقع پر فارغ ہونے والے طلبہ اپنے تاثرات کا اظہار کرتے اور اساتذہ کرام انہیں نصیحتیں کرتے ہیں۔ ۲۲ جنوری ۱۹۹۳ء کو آخری چار گھنٹوں میں اس سال بھی الوداعیہ کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں تمام اساتذہ کرام اور کارکنان جامعہ موجود تھے۔ متعدد طلبہ اور اساتذہ نے اس موقع پر اپنے جذبات کا اظہار کیا اور مختلف مشورے سامنے آئے۔ سراج احمد نے بتایا کہ میں نے بہت سے مدارس سے استفادہ کیا ہے، لیکن جامعہ کو ان تمام میں ممتاز پایا ہمارے اساتذہ ایسے مخلص ہیں کہ جس وقت بھی خدمت میں حاضر ہوا انہوں نے تعاون سے گریز نہیں کیا۔ مجھے اپنے کو نکھارنے اور سنوارنے کا یہاں سنہری موقع ملا، اگر میں اس سے پورے طور پر استفادہ نہیں کرسکا تو یہ میری اپنی کمی ہے اس کا ذمہ دار میں دوسروں کو ہرگز نہیں قرار دے سکتا۔

سراج الدین کا تاثر تھا کہ جو کچھ مجھے یہاں رہ کر حاصل کرنا چاہئے تھا اپنے حالات

اور اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے اس میں کمی رہی۔ میں نے جو کچھ حاصل کیا وہ میرا انتہائی قیمتی سرمایہ ہے۔ جو بھی فکر پائی وہ انتہائی صالح اور عقل سلیم کے مطابق ہے۔ اسی فکر کو لئے میں رخصت ہو رہا ہوں۔ دنیا کے جس خطہ اور جس گوشہ میں رہوں گا اس پیغام کا امین و پاسبان رہوں گا۔ نذیر احمد بھی یہی کہہ رہے تھے جو امنگیں لے کر آیا پوری ہو گئیں اپنی کوتاہیوں کی وجہ سے کمی رہی۔ اساتذہ نے بھرپور تربیت کی انہوں نے شدت سے اس جانب بھی توجہ دلائی کہ عربی پنجم سے سند کا دروازہ کھول کر جامعہ نے اچھا نہیں کیا۔ تربیت کی اور فکر کی پختگی نہ ہونے کی وجہ سے پنجم سے جانے والے طلبہ وہ کردار ادا نہیں کر پاتے جو ان کے شایان شان ہے۔ شاہ عالم نے کہا سولہ سال سے یہاں پڑھ رہا ہوں۔ کتنی خزائیں اور کتنی بہاریں دیکھیں۔ بہت کچھ پایا۔ میرے اساتذہ نے مجھے سنوارنے میں بڑی جدوجہد کی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ میں آج کسی قابل ہو سکا۔ غطریف احمد نے بتایا کہ جامعۃ الفلاح میں قرآن کی اعلیٰ اور محققانہ تعلیم دی جاتی ہے۔ شمشاد حسین نے جامعہ کے فارغین سے امت کی قیادت میں نمایاں رول ادا کرنے کی توقع ظاہر کرتے ہوئے اساتذہ اور جامعہ سے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

مولانا ابوبکر صاحب اصلاحی نے کہا جہاں خوشی ہوتی ہے کہ یہ ادارہ جس مقصد کے لئے قائم کیا گیا تھا اسی مقصد کی راہ میں رواں دواں ہے اور ایک تازہ دم گروپ فارغ ہو کر اعلائے کلمۃ اللہ کیلئے میدان عمل میں اتر رہا ہے وہیں اپنے عزیز طلبہ کو رخصت کرتے ہوئے ہمیں غم بھی ہو رہا ہے۔ یہ ادارہ آپ کا ادارہ اور اساتذہ آپ کے اساتذہ ہیں انہیں دعاؤں میں یاد رکھئے گا۔

مولانا عمران خاں صاحب فلاحی نے جامعہ کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بتایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ سارے پرانے اساتذہ موجود ہیں، سوائے مولانا محمد شہباز اصلاحی اور مولانا جلیل احسن ندوی کے، ایک مرحوم ہو گئے اور دوسرے ندوہ میں ہیں۔ انہوں نے بتایا دیکھ لیجئے۔ مولانا ابوبکر اصلاحی، مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی، مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی، مولانا عبدالحسیب صاحب اصلاحی، مولانا شبیر صاحب اصلاحی، مولانا

محمد عنایت اللہ صاحب اصلاحی، مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی، مولانا رحمت اللہ اثری صاحب فلاحی۔ ہمارے پرانے اساتذہ یہاں آپ کے سامنے ہیں اور یہ اساتذہ اب پہلے سے زیادہ تیار ہیں۔ غور و فکر کا مقام ہے کہ آخر کیا بات ہے کہ سارے پرانے مالی موجود ہیں لیکن پھولوں میں وہ پرانی خوشبو نہیں، جس سے ایک دنیا معطر ہوئی اور جس سے جامعہ کا نام روشن ہوا۔ انہوں نے بتایا انسان کا معاملہ اینٹ اور پتھر سے مختلف ہے۔ ایک عمارت بنانا چاہتے ہیں تو چاہے ہم بنا دیں گے۔ لیکن اگر انسان کے اندر شوق اور خواہش نہ ہو تو پوری جامعہ لپٹی رہے کچھ نہیں ہو سکتا۔

صدر جامعہ مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی نے طلبہ کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ بلندی کی کوئی حد نہیں۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

۲۳ جنوری ۱۹۹۳ء کو کلیۃ البنات سے فارغ ہونے والی طالبات کو بھی الوداعیہ دیا گیا۔

اس سال درج ذیل طلبہ فارغ ہو رہے ہیں۔

(۱) شمشاد حسین بجنور (۲) تنویر عالم دہلی (۳) سراج احمد گونڈہ (۴) شہنواز احمد اعظم گڑھ (۵) عبدالواحد ظفر سدھارتھ نگر (۶) محمد شریف میرٹھ (۷) اکرم حسین سدھارتھ نگر (۸) نسیم الحسن بستی (۹) عبدالحق [illegible] (۱۰) [illegible] الدین [illegible] (۱۱) محمد الیاس نیپال (۱۲) سراج الدین [illegible] (۱۳) محمد شبلی [illegible] (۱۴) [illegible] (۱۵) ذکاء اللہ گونڈہ (۱۶) عبیدالرحمان نیپال (۱۷) عارف حسین نیپال (۱۸) [illegible] الدین بلریا گنج (۱۹) شاہ عالم اعظم گڑھ (۲۰) ابوطلحہ بلریا گنج (۲۱) مراد اللہ سدھارتھ نگر (۲۲) انوار الدین سدھارتھ نگر (۲۳) نذیر احمد کشمیر۔

۴۰ طالبات اس سال فارغ ہونے والی ہیں اور گذشتہ سال ۱۳ طالبات فارغ ہوئی تھیں۔

یوم جمہوریہ پر صدر جامعہ کی تقریر

۲۶ جنوری ۱۹۹۳ء کو حسب معمول تعلیم بند رہی۔ صرف صدر جامعہ مولانا نظام الدین صاحب اصلاحی نے تقریر کی اور بتایا کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء سے بے شک مسلمان ہندی ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمان غمزدہ ہیں۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء والا دستور عملاً ختم ہوا۔ اور سیکولرزم کے تار و پود بکھر گئے۔ اب یہ جمہوریت ہے یا نہیں، اس میں مسلمانوں کو شبہہ ہے۔ جس حکومت کے پاس فوج ہو سارے

وسائل ہوں، اس کے لئے مسجد کی حفاظت کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن اسرائیل اور امریکہ کے اشارہ سے یہ سب کچھ کیا گیا۔ بابری مسجد کے علاوہ مزید ۲۵ مسجدیں شہید کی گئیں، بے شمار قبریں اور خانقاہیں برباد کی گئیں، پانچ ہزار مسلمانوں کو وہاں سے نکالا گیا۔ لیکن بابری مسجد کا غم اتنا شدید تھا کہ یہ سب باتیں دب گئیں۔ صدر جامعہ نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ غیر جمہوری غیر آئینی بلکہ کھلم کھلا عدالت کی توہین کرتے ہوئے کچھ شر پسندوں نے اجودھیا میں ایک عظیم تاریخی مسجد کو ڈھادیا تو حکومت نے کوئی کاروائی نہیں کی اور جب مسلمان اس کے غم میں بجا طور پر سڑکوں پر نکل آئے تو ان پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ اس سلسلہ کا امیر جماعت اسلامی بھوپال مولانا عبدالمالک صاحب کا سانحہ نہایت دردناک اور دل ہلا دینے والا ہے۔ آئین کی محافظ پولیس ان کے گھر کے اندر گھسی اور ان کے دو نوجوان لڑکوں کو گھسیٹ کر باہر لائی اور پھر اس نے ان سے سوال کیا کہ تم میں سے کون پہلے مرنا چاہتا ہے بڑے لڑکے نے جواب دیا میں، اس پر چھوٹے نے مداخلت کی اور کہا کہ یہ شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں اس لئے میں پہلے مرنا چاہتا ہوں۔ یہ کہنا تھا کہ گولی اس کے سینہ سے پار ہو گئی اور وہ وہیں شہید ہو گیا۔ اس کے بعد سنگدل پولیس نے بڑے بھائی کو بھی گولی مار دی مگر اللہ کا کرنا وہ علاج کر کے صحت یاب ہو گیا۔

سورت کا یہ حادثہ جو آواز ملک میں شائع ہوا وہ بھی دل ہلا دینے والا ہے۔ مسلمان عورتوں کو ننگا کر کے سڑکوں پر دوڑایا گیا۔ عزت لوٹی گئی اور اس کی ویڈیو فلم تیار کی گئی اور بہت سے نوجوانوں کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے گئے جلتا ہوا ٹائر گردن میں ڈال دیا گیا اور اس طرح دوڑا دوڑا کر انھیں ہلاک کیا گیا۔

مسجد کا ڈھایا جانا، مسلمانوں پر فائرنگ کرنا اور اوپر کے یہ واقعات قدیم گہری سازش کا نتیجہ ہیں۔ صدر جامعہ نے کہا سازش کرنے والے خود سازشوں کے جال میں پھنستے ہیں وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ۔ روس نے بھی اسلام کا راستہ روکنا چاہا تھا لیکن اس کا حشر دنیا کے سامنے ہے۔ مولانا نے یہ بات بھی کہی کہ حالات کے لحاظ سے قرآن میں آیتیں ہیں۔ اس طرح کی آیات پر عمل کرنے کا وقت آیا یا نہیں ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔

ہیئت ۲۶ر جنوری کا پروگرام بہت ہی رنگارنگ ہوتا تھا لیکن غم میں ڈوبا ہوا ماحول اس کے لئے سازگار نہیں تھا اس لئے صرف صدر جامعہ کی تقریر بحالت غم میں یہ پروگرام اختتام کو پہونچا۔

دہلی یونٹ اور جامعہ و قصبہ کے فلاحی برادران کی نشستیں

انجمن کی دہلی یونٹ اپنا ماہانہ پروگرام پابندی سے کرتی ہے۔ ۱۰ر دسمبر ۹۲ء کو اس کی نشست ہوئی تھی۔ جس کی رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بعض پرانے فلاحی بھی انجمن کے تئیں سرگرم ہو رہے ہیں۔ اس دفعہ دہلی کی سطح پر یہ طے کیا گیا ہے کہ کم از کم ہر فلاحی "حیات نو" کا خریدار بن جائے۔ جامعہ ملیہ کی طلبہ یونین میں حصہ لینے کے بارے میں طے پایا کہ حمایت کا انحصار امیدوار کے ذاتی اوصاف حمیدہ پر ہوگا آئندہ نشست ۲۴ر جنوری ۹۳ء کو ہونا طے تھی۔ خدا کرے وقت پر ہوئی ہو۔

جامعۃ الفلاح میں بھی اجلاس عام کے بعد سے پابندی سے نشستوں کا اہتمام ہوا ہے۔ پہلی نشست ۵ر نومبر ۹۲ء دوسری نشست ۷ر دسمبر ۹۲ء تیسری نشست ۲ر جنوری ۹۳ء اور چوتھی نشست ۱۷ر فروری ۹۳ء کو ہوئی۔ بالعموم ان نشستوں میں تعلیم و تربیت میں بہتری لانے، انجمن کو فعال اور موثر بنانے پر غور و خوض ہوا نیز ایک دوسرے کی کارکردگی کا جائزہ بھی لیا

ابواللیث ہال میں استقبالیہ

قارئین کو یاد ہوگا جامعہ میں زیر تعمیر وسیع و عریض ہال کا افتتاح انجمن کے پانچویں اجلاس عام کے موقع پر سمینار سے ہونا تھا لیکن اس وقت یہ ممکن نہ ہو سکا۔ الحمدللہ اب یہ ہال کسی حد تک قابل استعمال ہو گیا ہے۔ فرش، پلاسٹر دروازوں اور کھڑکیوں کا کام باقی ہے۔ امسال اسی ہال میں امتحان ہو رہا ہے۔

انجمن کو یہ سعادت ملی کہ اس نے سب سے پہلے اپنی باقاعدہ نشست ۱۷ر فروری ۹۳ء کو اس ہال میں کی جس میں فارغ ہونے والے طلبہ کو انجمن کی جانب سے استقبالیہ دیا گیا تھا۔

اس موقع پر ظہرانہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

انجمن ہر سال فارغ ہونے والے طلبہ کو استقبالیہ دیتی ہے۔ جس میں فراغت کے بعد کی

ذمہ داریاں یاد دلائی جاتی ہیں۔ اور اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ فراغت کے بعد بھی ان کا تعلق جامعہ سے باقی رہے۔ جامعہ کے مقاصد اسلام کے مقاصد ہیں یعنی اللہ کے کلمہ کی سربلندی۔ انجمن اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے فارغین جامعہ کو منظم کرتی ہے۔

سکریٹری انجمن کو صدمہ

نائب صدر جامعہ، اور سکریٹری انجمن طلبہ قدیم جناب مولانا محمد عمران احمد خاں صاحب فلاحی کے عم محترم جناب عابد علی صاحب ملیشیا میں حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے ۱۵ر جنوری ۱۹۹۳ء کو انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم بڑے ہنس مکھ انسان اور پربہار شخصیت کے مالک تھے۔ ملیشیا میں ان کا قیام تھا۔ ادھر کے لوگ اگر وہاں پہونچ جاتے تو ان کی ضیافت اپنا فرض سمجھتے اور اپنا دل نکال کر رکھ دیتے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

زبیر اختر فلاحی کو صدمہ

تحریک اسلامی کے ایک ہمدرد، تہجد کے پابند، قرآن و حدیث کا ترجمہ و تشریح گاہے گاہے مسجد میں پڑھ کر سنانے والے اور نزاعی جھگڑے، فرقہ بندی اور گروہی عصبیت سے دور جناب معین الدین صاحب کے انتقال پر ملال سے زبیر اختر اور نوریہ فاطمہ فلاحی، سکریٹریٹ اعظم گڑھ، دوسرے بھائی بہنوں کے ساتھ اپنے والد کے سایہ پدری اور دست شفقت سے محروم ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق دے۔

نماز جنازہ میں طلبہ و اساتذہ کے ایک وفد نے شرکت کی، جن میں راقم کے علاوہ مولانا عبد الحسیب صاحب اصلاحی، مولانا محمد سلامت اللہ صاحب اصلاحی، مولانا رحمت اللہ صاحب فلاحی، مولانا عمران صاحب فلاحی اور مولانا نور محمد صاحب فلاحی شامل تھے۔ نماز جنازہ سے پہلے، جمعہ کے بعد ان کے لڑکے زبیر اختر فلاحی حاضرین سے کہہ رہے تھے کہ اگر ان کے والد کی جانب سے کسی کو کوئی تکلیف پہونچی ہو تو لوگ انہیں معاف کر دیں اور اگر ان کے ذمہ کسی کا کسی بھی طرح کا بقایا ہو تو مطلع کیا جائے تاکہ اس کی ادائیگی ہو سکے۔ مرحوم کے دو بیٹے فلاحی ہیں اور دو جامعہ میں زیر تعلیم۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ سب ان کیلئے صدقہ جاریہ بنیں۔

سالانہ امتحان شروع

۹۳-۱۹۹۲ء کا سالانہ امتحان شروع ہو چکا ہے۔ ۴ پرچے ختم ہو چکے ہیں۔ مصباح العلوم چوکونیاں کے آخری درجہ کے طلبہ جناب ولی اللہ سعیدی فلاحی کے ہمراہ امتحان دینے جامعہ آئے ہوئے ہیں، اور جامعہ کے دو اساتذہ جناب مشتاق احمد فلاحی اور جناب ظفر احمد فلاحی جو ملحقہ مدارس کے امتحان کی نگرانی کیلئے بستی گئے ہوئے تھے، واپس آ گئے ہیں اور ان کی جگہ جناب مولانا صباح الدین ملک فلاحی، قاسمی علیگ اور جناب مولانا جلال الدین صاحب مفتاحی وہاں کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔

جمعیت کے سالانہ انعامی مقابلے ۹۳-۱۹۹۲ء

ابو صالح اعظمی
(سکریٹری جمعیت)

طلبہ کی ذہنی، جسمانی اور تکنیکی صلاحیتوں کو نشوونما دینے کے لئے سال بھر جمعیۃ الطلبہ کی جانب سے مختلف قسم کے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ سال کے اختتام پر مزید تشویق و ترغیب اور حوصلہ افزائی کی خاطر جمعیت کی جانب سے انعامی مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ اس سال بھی قرأت و تجوید، بیت بازی، تقریر اور کھیل کے مقابلوں کا اہتمام ہوا۔ ان مقابلوں میں درج ذیل طلبہ اول، دوم اور سوم انعام کے مستحق قرار پائے۔

مقابلہ قرأت و تجوید (الف) برائے درجہ حفظ:- I شجاعت حسین II مشتاق الاسلام III نعمان انور۔ (ب) برائے عربی اول تا عربی سوم۔ I ضمیر اللہ II نجم السحر III ریحان بدر (ج) برائے عربی چہارم تا عربی ہفتم۔ I اکبر علی II ملک راشد فیصل اور محمد ابراہیم III ابوبکر صدیق

مقابلہ بیت بازی:- (الف) برائے درجہ پنجم و ششم (ابتدائی)۔ I وسیم احمد II جمیل احمد III صلاح الدین ایوب (ب) برائے عربی اول I عنایت اللہ II اشتیاق عالم III تسنیم قمر (ج) برائے عربی دوم و سوم I فیصل امین الاسلام II محمد اسجد III عبید الرحمٰن اور عزیز الرحمٰن (د) برائے عربی چہارم و پنجم I ابوبکر صدیق II عبد المنان III اکرام الرحمٰن (ہ) برائے عربی ششم و ہفتم I عبد القادر II اشرف دار III اسامہ اکرم

مقابلہ خطابت اردو (الف) برائے درجہ ہفتم و ہشتم ثانوی I عظیم الدین II حشمت ظفر III رضوان عالم اور رضوان عالم خاں (ب) عربی اول I اشتیاق عالم II عنایت اللہ III تسنیم قمر (ج)

برائے عربی دوم I منہاج الدین II علی مرتضیٰ III بشیر احمد (د) برائے عربی سوم I نجم السحر ثاقب II سید فیصل اقبال III فیصل امین الاسلام (ھ) برائے عربی چہارم I ثاقب حسین II الیاس احمد خان اکولوی III عبدالخالق سمیع (و) برائے عربی پنجم I ابوبکر صدیق II محمد حاذق III قطب الدین

مقابلہ خطابت عربی (الف) برائے عربی اول و دوم I معراج مبارک II عبدالعزیز فارس III بشیر احمد (ب) برائے عربی سوم و چہارم I ضمیر الحسن II سید فیصل اقبال III طارق حسین (ج) برائے عربی پنجم تا ہفتم I محی الدین غازی II ابوبکر صدیق III غطریف شہباز۔

مقابلہ خطابت انگریزی (الف) برائے عربی اول و دوم I ریحان بدر II گوہر اقبال III نعیم قمر (ب) برائے عربی سوم و چہارم I ملک راشد فیصل II ابو محترم III سید فیصل اقبال (ج) برائے عربی پنجم تا ہفتم I ممتاز عالم II ابوبکر صدیق III غطریف شہباز۔

انشا و مضمون نویسی مقابلوں کے نتائج تیار نہیں ہو سکے ہیں۔ گیم کے مقابلوں کی تفصیل بھی اس وقت دینے سے ہم معذور ہیں۔

پچھے چھپے

متعدد فلاحی برادران کو صدمہ بڑے دکھ کے ساتھ اطلاع دی جاتی ہے کہ خالد سیف اللہ فلاحی اور محمد ساجد فلاحی (ہلدوانی) کو اپنی والدہ کے انتقال کا غم اٹھانا پڑا۔ مرحومہ ایک لمبے عرصہ سے علیل تھیں۔ اسی طرح غفران احمد کے دادا جان جناب شیخ سلطان صاحب بھی ۶ر فروری ۹۳ء کو وفات پا گئے۔ مرحوم سابق ناظم جامعہ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب کے بریا گنج مڈل اسکول میں کلاس فیلو تھے۔ ہم ان دونوں بھائیوں کے غم میں شریک ہیں۔ اور مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتے اور پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی دعا کرتے ہیں۔

تعطیل کلاں ۲۴ر شعبان مطابق ۱۰ر فروری ۱۹۹۳ء چہارشنبہ سے ۷ شوال مطابق ۳۱ر مارچ ۱۹۹۳ء تک مدرسہ بند رہے گا لیکن نئے سال کا آغاز ۱۰ر شوال مطابق ۳ر اپریل ۱۹۹۳ء شنبہ سے ہوگا

بہی خواہان جامعہ کی خدمت میں

حاجی عبدالمتین
ناظم جامعہ

آج کے طوفانی دور میں جب کہ ہر طرف مادیت کی یلغار ہے اور اخلاقی قدریں روبہ زوال ہیں، اسلام پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور ملت اسلامیہ کو مختلف قسم کے چیلنجوں کا سامنا ہے، ایسے پرآشوب دور میں "جامعۃ الفلاح" ان چیلنجوں کا ایک پرعزم جواب ہے جہاں مسلمان بچوں اور بچیوں کی اس انداز سے تعلیم و تربیت کی جاتی ہے کہ ان کے اندر کتاب و سنت کا گہرا علم پیدا ہو اور اسلامی اخلاق و کردار سے آراستہ ہوں، عصر حاضر کے افکار و نظریات سے واقفیت ہو اور ان کے اندر احیائے دین اور شہادت حق کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ وہ وسعت قلب و نظر کے ساتھ معاشرے کی اصلاح اور دعوت اسلامی کے لئے اپنی صلاحیتوں کو وقف کر سکیں۔

نیچے جامعہ کے نمائندوں اور ان کے حلقہ کار کی فہرست دی جا رہی ہے۔ براہ کرم بہی خواہان جامعہ ان کے ساتھ اپنی دلچسپیوں اور ہمدردیوں کا ثبوت دیں۔

(۱)	جناب مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی	حیدرآباد
	" حافظ جاوید سلطان " فلاحی	"
(۲)	" مولانا اظہار احمد، مدنی	مدراس، کرناٹک، تامل ناڈو، کیرالا
	" حافظ محمد اسماعیل	" "
(۳)	" مولانا مصباح الدین حسن فلاحی، قاسمی، علیگ	کلکتہ، آسنسول، بردوان
	" ماسٹر سراج احمد صاحب	"
	" مولانا نعیم الدین صاحب اصلاحی	" " " " آخری عشرہ میں
	" حافظ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب فلاحی	" " "
(۴)	" منشی سہیل صاحب (سفیر جامعہ)	رامپور، ہلدوانی، بریلی، علیگڑھ، آگرہ، کانپور وغیرہ

جناب مولانا صغیر احسن صاحب اصلاحی — رامپور، بدایوں، بریلی، علی گڑھ، آگرہ، کانپور وغیرہ

(۵) " عرفان احمد صاحب فلاحی — بھیونڈی، کلیان، دھولیا، مالیگاؤں، ناسک، امارہ

" ~~عتیق الرحمٰن~~

" امیر فیصل — کولابہ، ساکی ناکہ، گھاٹ کوپر، وکرولی، بھانڈوپ، ام، گوونڈی، ریجپور، مروّل ناکہ، خیرانی روڈ، چکالہ، شیواجی نگر، بیگن واڑی، سلائی واس، واکولہ

" " کمال الدین " "

" " کمال الدین " " — ریے روڈ، ماہم، دھاراوی، سائن، باندرہ، سانتا کروز، ویلے پارلے، اندھیری، جوگیشوری، گورے گاؤں، کاندیولی، گنیش نگر، ملاڈ، بوروولی، پونا۔

" ~~ماسٹر حبیب صاحب~~

" عبدالمالک " — مدنپورہ، بائیکلہ، بھنڈی بازار، پوری بندر، قلابہ، گرانٹ روڈ، بمبئی سنٹر، سات راستہ، ڈونگری، دادر، ٹیمکر، کماٹی پورہ، چوکی محلہ، ہنجر اسٹریٹ، جے جے ہاسپٹل، دو ٹانکی، جیراج گلی، مومن پورہ، مدنپورہ، کالا گھوڑا

(۶) جناب مولانا جمیل احمد صاحب فلاحی — دہلی، ~~جامع مسجد، جنگی تیر، دریا گنج، چاندنی چوک، بلیماراں، لال کنواں، فتح پوری، صدر بازار، آزاد مارکیٹ، جعفر آباد، رام نگر، شاہدرہ~~

(۷) " " افتخار احمد صاحب ندوی — احمد آباد، واپی وغیرہ گجرات

(۸) " حافظ احسان الحق صاحب فلاحی — اندور، اجین

(۹) " مولانا امیر الحسن صاحب " — سنبھل، بدایوں، کیرانہ

" " ذوالتاج احمد صاحب

(۱۰) جناب قاری شمیم صاحب — جلگاؤں، بھساول، برہانپور، ملکاپور، جالنہ، اکولہ، اورنگ آباد

" عطاء اللہ

(۱۱) " ~~شکیل احمد~~ رفیق الاکرم صاحب — راجستھان

" ~~ظفر بستوی صاحب فلاحی~~

(۱۲) " ماسٹر منور علی صاحب — جونپور، بنارس، اضلاع کرامت، روہری، مرکا، بنجارے پور

(۱۳) " عالمگیر صاحب (سفیر جامعہ) — دیوریا، ناگپور، جبل پور، سیونی، چھندواڑہ

(۱۴) " ماسٹر نظام الدین صاحب — گورکھپور، بستی، گونڈہ، بہرائچ، سدھارتھ نگر

(۱۵) " مولانا عبداللطیف صاحب فلاحی — مئو، کوپا، باتھرا روڈ، ادری، اندارا، گھوسی

" ماسٹر حنیف صاحب

(۱۶) " محسن صاحب (سفیر جامعہ) — فیض آباد، ٹانڈہ، سلطان پور

(۱۷) " ~~ماسٹر علی اور بیگ صاحب~~ — مرزاپور، اوبرا، بھدوہی، بادشاہ پور، مرزا پور، الہ آباد، بیرداہ، سرائے عاقل، کپتان پور، منو آئمہ، کڑھ، کھوبا، پھولپور، مہراج گنج، چپ چنار، رابرٹس گنج، بندھیاچل، چاند پٹی، پرشنی، کرینی، فتح پور، سون برنگ

" ہارون رشید صاحب

(۱۸) جناب ماسٹر اختر الزماں صاحب — مبارک پور، محمد آباد، مضافات

" ~~حافظ ارشاد احمد~~

(۱۹) " ماسٹر شہنواز صاحب، منور احمد صاحب، حافظ ریاض احمد صاحب،
" کفیل احمد صاحب، ماسٹر عبدالکریم صاحب، ماسٹر محی الدین صاحب
" حکیم جلال الدین صاحب، ماسٹر مسعود صاحب
" مولانا محبوب عالم صاحب فلاحی